مضامینِ برق

(۱۹۲۶ء تا قیامِ پاکستان)
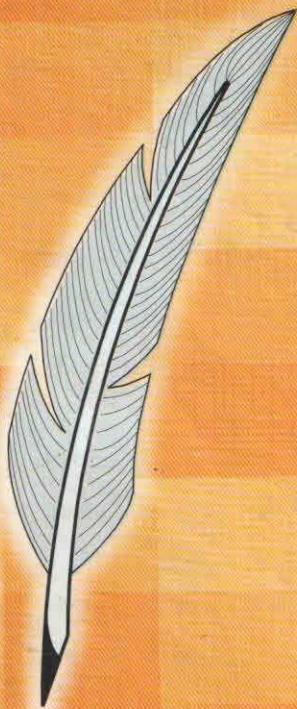
ڈاکٹر غلام جیلانی برق

مرتّب

اعزازی کیپٹن (ر) الحاج عبداللہ خان
تمغۂ خدمت درجۂ اوّل (ایئر ڈیفنس)

مضامینِ برق

(۱۹۳۶ء تا قیامِ پاکستان)

مصنّف

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

مرتّب

اعزازی کیپٹن (ر) الحاج عبداللہ خان

تمغۂ خدمت درجۂ اوّل (ایئر ڈیفنس)

سرمد اکیڈمی، اٹک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے برادرِ عزیز

غلام یحییٰ صاحب

کے نام

جو غلام ربانی عزیز اور ڈاکٹر برق کے بہت عزیز تھے

اللہ کریم ان سب عالم بھائیوں کی مغفرت کرے (آمین)

☆☆☆

فہرستِ مندرجات

☆☆☆

عرضِ مرتب

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ مرحوم و مغفور ہمارے مُلک اور متحدہ ہندوستان کے ایک نام ور معلم، محقق، مصنف، شاعر، نقاد اور دینی سکالر تھے۔آپ کی تحریریں آج تک اُسی طرح اہلِ ذوق میں مقبول ہیں جیسی کہ اُن کے دور میں تھیں اور اُمید کی جا سکتی ہے کہ اہلِ علم آیندہ بھی ان کی بے مثال تحریروں کو اسی دل چسپی اور انہماک کے ساتھ پڑھتے رہیں گے۔حالات و واقعات پر برقؔ صاحب کی نظر اس قدر عمیق اور دُور رس تھی کہ آج بھی اُن کی تحریریں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ تحریریں اسی دور کے لیے لکھی گئی ہیں۔

راقم الحروف اپنے آپ کو اُن کے خاندان کا فرد ہونے پر قابلِ فخر سمجھتا ہے تاہم اُن کے بے پناہ علمی کارناموں سے لگاؤ اور تعلقِ قلبی کو اس رشتے پر فوقیت دینا بھی قابلِ افتخار سمجھتا ہے۔میری خوش نصیبی ہے کہ فوج سے سُبکدوشی کے بعد مجھے دس سال تک ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کے برادرِ اکبر پروفیسر غلام ربانی عزیزؔ کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔اُن کی صحبت کی تاثیر ہے کہ میں بھی لکھنے پڑھنے کے کاموں میں شریک ہونے لگا ہوں؛ بہ قول شیخ سعدیؒ:

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ان دونوں عالم بھائیوں کے بے شمار شاہکار منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ہر دو

حضرات کی تصانیف نے بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ لیکن کچھ مسوّدات ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔ میں انھیں منظرِ عام پر لانا بہت ضروری خیال کرتا ہوں۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو اہلِ علم میں شمار نہیں کرتا لیکن اہلِ علم ودانش سے جنون کی حد تک عقیدت رکھتا ہوں۔ میری خواہش کہ ان دونوں عالم بھائیوں کی غیر مدون تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کر کے نئی نسل تک پہنچاؤں۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے پروفیسر غلام ربانی عزیزؔ کی وفات کے بعد ان کا ترجمہ شدہ ایک رسالہ سیرۃ النبی ﷺ شائع کیا اور اُن کے ایصالِ ثواب کی خاطر مفت تقسیم کیا۔ جنابِ شاکر القادری نے ڈاکٹر برقؔ کا کلام برقِ بیتاب کی صورت میں مرتب کیا تو اس کی اشاعت وطباعت میں بھی خاکسار نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ برقِ بیتاب کی اشاعت کے جُملہ اخراجات ڈاکٹر منصور قریشی نے برداشت کیے۔ موصوف ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کے داماد ہونے کے علاوہ اُن کے بہت بڑے مداح بھی ہیں ۔ میری طرح وہ بھی چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر برقؔ کے مضامین اور رشحاتِ قلم کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین کی اشاعت میں بھی اُن کا مالی تعاون شامل ہے۔ اس عنایتِ خسروانہ کے لیے میں ڈاکٹر منصور قریشی اور یاسمین قریشی کا از حد شکر گزار ہوں۔

کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ نے بڑی محنت اور کاوش سے ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کے خطوط جمع ومرتّب کیے۔ اُن کی اس گراں قدر محنت کو علمی وادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ پروفیسر غلام ربانی عزیزؔ کی وفات کے بعد مَیں نے مکاتیبِ عزیزؔ پر کام شروع کر دیا؛ خطوط کی جمع آوری اور ترتیب وتہذیب میں چار

سال کا عرصہ لگ گیا۔ بالآخر یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں طبع ہوئی اور اہلِ علم اور یارانِ عزیز میں بہت مقبول ہوئی۔

میں ابھی ''مشاہیر بنام ڈاکٹر برق'' کی ترتیب کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک شام ڈاکٹر م غلام جیلانی برق کے فرزند جناب کرنل (ر) ممتاز حمید صاحب میرے گھر آئے اور مجھے ایک فائل دی جس میں ڈاکٹر صاحب کی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۳ء تک کی تحریریں خود اُن کے اپنے ہاتھوں سے محفوظ کی گئی تھیں اور فائل پر ''مضامینِ برق'' لکھا تھا۔ چنانچہ میں نے متذکرہ منصوبے کو پسِ پشت ڈال کر ان مضامین کی ترتیب و تہذیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ تحریریں کچھ تو اخبارات و رسائل میں مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ تحریریں بہت اہم ہیں۔ جن میں مذہب، ادب، تحریکِ پاکستان اور تاریخ کے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔

ان مضامین کے مطالعے سے قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جناب برق کی ادبی زندگی ابتدائی مراحل میں کیسی تھی اور اُس کا کیا معیار تھا۔ پھر تحریکِ پاکستان میں آپ کا کردار قلم کے مجاہد کے طور پر کتنا واضح ہے لیکن یہاں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ اربابِ اختیار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہندوؤں کے ہر حربے کا جواب تحریری شکل میں احسن طریقے سے دینے والے مجاہد کو تو ''تحریکِ پاکستان میڈل'' سے نوازا نہیں گیا لیکن ایسے لوگوں کی پذیرائی کی گئی جو اُس وقت طفلِ مکتب تھے۔

ان شاء اللہ العزیز مضامین کی اشاعت کے بعد مضامینِ عزیز، مشاہیر بنام غلام جیلانی برق اور مشاہیر بنام غلام ربانی عزیز کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ہمت اور توفیق دے کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکوں۔ اس کام کے لیے

مجھے اُن اِشاعتی اداروں کا، جو کہ اِن دونوں عالم بھائیوں کی کتابوں کو چھاپ کر روپیہ بنا رہے ہیں، تعاون بھی درکار ہے اور عزیزانِ برقؔ و عزیزؔ کا بھی ممنون ہوں گا اگر وہ اس طرف توجہ دیں اور مالی تعاون کریں تا کہ یہ علمی وادبی منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں۔

میں ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی رائے سے نوازا۔ جناب ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ کا شکریہ ادا نہ کرنا نہایت کم ظرفی ہوگی کہ اُنھوں نے مضامین کی ترتیب میں میری مدد کی۔ اس کتاب کی اشاعت کا جملہ کام بھی اُنھی کی نگرانی میں ہوا۔

آخر میں صاحبانِ علم سے گذارش ہے کہ میری یہ کاوش آپ کو پسند آئے تو دُعا کیجیے گا اور اپنی آرا سے ضرور نوازیے گا تا کہ آیندہ کتابوں کو اچھے طریقے سے پیش کرنے کے قابل ہوسکوں۔

والسلام

اعزازی کیپٹن (ر) **عبداللہ خان**

۱۴۶۔اے، دارالسلام کالونی، اٹک

☆

حرفے چند

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا شمار ہمارے ضلعے کے اُن اکابرین میں ہوتا ہے جن کے کمالاتِ علمی و ادبی کا ایک زمانہ معترف بل کہ اسیر ہے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیمی درجوں میں ہی قرطاس و قلم سے ایسا مضبوط رشتہ اُستوار کیا جو زندگی بھر قائم رہا۔ اُن کی تصنیفی و تالیفی زندگی ساٹھ سال سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران میں اُنھوں نے نظم و نثر کی اکثر و بیشتر اصناف میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، علمی اور ادبی موضوعات پر تسلسل و تواتر سے لکھا۔ تین درجن سے زاید باقاعدہ کتابیں اُن کے قلم سے نکلیں اور مقبولِ عام و خاص ہوئیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں مقالات، مضامین، تبصرے، تجزیے، اداریے، کالم اور ریڈیائی تقریریں جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں، ہنوز غیر مدون صورت میں بکھری ہوئی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں راقم الحروف نے اقبال اور فکرِ اقبال سے متعلق اُن کے مقالات و مضامین کو جمع کرنے کی طرح ڈالی تھی؛ یہ مجموعہ مقالاتِ برق کے عنوان سے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ۱۹۹۲ء میں لاہور سے شائع کیا۔ ناشر نے حواشی و تعلیقات کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے نکال باہر کیا اور بتیس [۳۲] صفحات میں ٹھونس ٹھانس کر "روشن کتابیں" نامی اشاعتی سلسلے میں ایک نمبر کا اضافہ کر دیا۔ یوں یہ روشن کتابی سلسلہ تاریکی میں رہا اور اہلِ علم و ادب کی نگاہیں اس کے مندرجات سے نا آشنا رہیں۔ اور اب ____ اللہ بھلا کرے کیپٹن (ر) عبداللہ خان کا کہ اُنھوں نے کرنل (ر) ممتاز حمید برقؔ سے حاصل کردہ فائل سے گرد جھاڑی اور ڈاکٹر برقؔ کے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھے گئے مقالات و مضامین کی ترتیب و تہذیب کر ڈالی۔ اُن

کی اس سعی و کاوش کا حاصل اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں شامل مضامین ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کی ابتدائی تصنیفی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مضامین ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے کے دوران میں لکھے گئے ہیں۔ اکثر مضامین اُس دور کے معروف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے؛ کچھ اب تک غیر مطبوعہ تھے جو زیرِ نظر کتاب کے ذریعے پہلی بار قارئین کے سامنے آ رہے ہیں۔ ان مضامین میں مذہب، تاریخ، سیاست، ادب اور معاشرت جیسے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں جو غلام جیلانی برقؔ کے ذوقِ ہمہ رنگ کے عکاس ہیں۔ یہ مضامین جہاں برقؔ صاحب کے فکری ارتقا کو سمجھنے میں مددگار ہیں وہیں اُن کے اسلوبِ نگارش کے تشکیلی مراحل کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ برقؔ صاحب کا وہ خاص استدلالی اسلوب جو دو قرآن اور دو اسلام میں اپنی کامل صورت میں دکھائی دیتا ہے اس کے ابتدائی نقوش ان تحریروں میں جا بہ جا جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

کیپٹن (ر) عبداللہ خان سزاوارِ ستائش اور قابلِ داد ہیں کہ اُنھوں نے اس شرابِ کہن کو جامِ نو میں پیش کرنے کا جتن کیا ہے۔ اللہ کریم اُن کے جذب و شوق کو استقامت بخشے تاکہ وہ اسی ذوق و شوق اور محبت و اخلاص کے ساتھ بزمِ علم و ادب کی تشنگی کو مٹانے کا بندوبست کرتے رہیں۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ وابستگانِ علم و ادب ان کی اس کوشش و کاوش سے تادیر مستفید ہوتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

یکم۔ جولائی ۲۰۰۸

☆

کچھ یادیں، کچھ باتیں

______ غلام ربانی عزیزؔ (مرحوم) کے قلم سے

برقؔ عمر میں مجھ سے تقریباً چار برس چھوٹے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء ہے۔ مَیں گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور میں جونیئر سپیشل پاس کر کے چھٹی جماعت میں تھا اور وہ موضع بسال میں دوسری جماعت پاس کر کے تیسری جماعت میں تھے۔ جیسا کہ مَیں اپنے حالات میں بیان کر چکا ہوں (دیکھیے: مکاتیبِ عزیزؔ) والد صاحب نے ہمارے بڑے بھائی مولوی نورالحق کے کہنے پر مجھے سکول سے اُٹھا کر مسجد میں بٹھا دیا تو برقؔ ازخود مدرسہ چھوڑ کر میرے ساتھ آ کر مسجد میں بیٹھ گئے۔ اور کریما پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مَیں تو کریما کی نظموں کو یاد کرنے سے ایک دفعہ ۱۰ لاتیں کھا کر چھوٹ گیا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے، مَس آئندہ کبھی کوئی چیز حفظ نہیں کروں گا، مگر برقؔ کو جو سبق ملتا وہ اُسے یاد کر کے سنا دیا کرتے چنانچہ تیس تیس اشعار یاد کر لیتے اور سنا دیتے۔ ممکن ہے بچپن میں اُن کا حافظہ مجھ سے بہتر ہو۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اُستادِ مہربان کے تھپڑوں اور لاتوں سے بوجہ چھوٹا ہونے کے زیادہ ڈرتے تھے۔

ایک دِن ہم دونوں مسجد میں اکیلے تھے اور برقؔ حسبِ معمول پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے۔ مَیں اُنہیں منع کر رہا تھا۔ چونکہ اُستادِ مہربان گھر گئے ہوئے تھے، مجھے ڈر تھا کہ وہ آ گئے تو ہم دونوں پٹیں گے۔ کیونکہ اِس درس گاہ میں باتیں کرنا اور ہنسنا جُرم تھا۔ وہ ہنس رہے تھے کہ اُستاد صاحب آ گئے اور برقؔ کے سَر پر ایسی لات لگائی کہ اِن کا ہونٹ پھٹ گیا۔ اور خون بہہ نکلا، چونکہ مَیں بھی اُستادِ مہربان کے ہاتھوں تقریباً

روزانہ پٹتا تھا۔ مَیں نے موقع سے فائدہ اُٹھانا مناسب سمجھا۔ اُس دِن والد صاحب مسجد سے متصل کچھ مہمانوں سے محوِ گفتگو تھے۔ مَیں نے برقؔ سے کہا، جاؤ اور اباجی کو بتلاؤ، والد صاحب نے بیٹے کو اِس حال میں دیکھا تو اُٹھ کر مسجد میں آئے، برادرِ نامہربان سے کچھ تلخ وترش باتیں ہوئیں اور نتیجتاً ہمیں کچھ عرصہ کے لیے پڑھنے سے نجات مل گئی اور اُستاد صاحب واپس دیوبند چلے گئے۔

مَیں نے گورنمنٹ ہائی سکول میں پھر سے داخلے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ والد صاحب نے بعض علما کو تنخواہ پر پڑھانے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ناچار ناراض شدہ بیٹے کو دیوبند سے پھر بلالیا اور ہم بے زبانوں کو پھر اُن کی تحویل میں دے دیا۔ بھائی صاحب ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ اِن کے ازدواج کا بندوبست کرنا والد صاحب کا فرض تھا لیکن ہمارے گھر میں کبھی اِس کا ذکر ہُوا ہی نہ تھا۔ نہ معلوم والد صاحب اِس باب میں کیوں اِس طرح خالی الذہن تھے۔ بھائی صاحب کی برہمی اور درشت مزاجی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

جس دِن شام کو وہ واپس پہنچے، دوسرے دِن ہی ہماری قیدِ تنہائی بامشقت شروع ہوگئی۔ اب ہم تقریباً بالغ ہو چکے تھے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بھائی صاحب نے پھر سے ہمیں پیٹنا شروع کر دیا۔ والدہ نے کہہ کہہ کر والد صاحب کو آمادہ کرلیا کہ ہمیں اِس بوچڑ خانے سے نکال کر اورنگ آباد میں حضرت مولانا گلاب شاہ اور اِن کے صاحبزادے مولانا عبدالرؤف کی تحویل میں دے دیں۔ یہ گاؤں تین میل کے فاصلے پر تھا۔ روزانہ صبح کو جاتے اور دوپہر یا شام کو واپس آجاتے۔

اِس آزادی سے ہم نے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا سوائے جمعہ کے ہر روز

جاتے اور سو جاتے۔ ایک دِن سردی کے موسم میں مجھے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ میرے پاس کھدّر کی ایک چادر تھے۔ بعد از نماز عشاء حضرت اُستاد نے مجھے دیکھ لیا۔ فرمایا، تم اِس کونے میں پڑے ہو۔ مَیں جاتے ہوئے اپنی چادر تم پر ڈال دوں گا۔ مَیں لیٹ گیا۔ حضرت نے از راہِ شفقت چادر مجھ پر ڈال دی اور خود صرف کُرتے میں گھر چلے گئے۔

ابنِ یمین کا ایک قطعہ حسبِ حال ہے پیش کرتا ہوں۔

شنیدہٴ تو؟ کہ محمود غزنوی شب دی
نشاط کرد دشش جملہ در سمور گذشت
یکے فقیرے درآں شب، سَر تنور گزید
شب تنور برآن درد مند عور گذشت
چو صبح گشت برآورد نعرہ خامے محمود
شب سمور گذشت و شب تنور گذشت

جیسا کہ مَیں اپنی سرگذشت (مکاتیبِ عزیز) میں بیان کر چکا ہوں کہ مَیں نے کچھ عرصے کے بعد مختلف درس گاہوں میں جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ برقؔ کے متعلق اتنا یاد ہے کہ کچھ عرصہ انھوں نے موچیوں کی ڈھوک (اکھوڑی) پہ گزارا تھا۔ مولانا صاحب ہمارے خالو تھے۔ لیکن چونکہ ہماری خالہ فوت ہو چکی تھی اِس لیے اِس ناخواندہ مہمان کو بلائے بے درماں سمجھا گیا اور مسجد ہی اِن کی قیام گاہ اور مسجد ہی طعام گاہ تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا، رات کو وہیں پڑے رہتے، اکثر تنہا ہوتے، رات کو ڈرتے اور چیخیں مارتے، بُخار میں مبتلا ہو گئے۔ گاؤں اب بھی علاج کی سہولت سے محروم تھا۔ یہ واقعہ آج سے اسی ۸۰/ برس پہلے کا ہے۔ کہا کرتے تھے، ایک دِن ذرا افاقہ ہوا تو

مَیں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا اور گھر آ کر دم لیا۔ جان بچی سولاکھوں پائے۔

اِس کے بعد کچھ عرصہ پنڈی سرہال میں مولانا عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، نرم دل بزرگ تھے۔ شفقت سے پیش آتے تھے۔ جب میں ڈریالہ جالپ گیا، برقؔ بھی ساتھ تھے۔ پھیکے پانی، خشک ماحول نے ہمیں وہاں ٹکنے نہ دیا۔ ایک دِن مجھے کہا کہ مَیں اِس بدمزہ بستی سے سخت بیزار ہو گیا ہوں۔ بیزار میں بھی تھا۔ کہا، بھاگ جاؤ۔ نمازِ عصر کے بعد وہ بھاگ کر سٹیشن پر پہنچے اور بے ٹکٹ گاڑی پر سوار ہو کر گھر پہنچ گئے۔ دو دِن بعد بھائی صاحب نے مجھے بھی یک بینی و دو گوش بھگا دیا۔ سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے۔

اب ہم اِس عہد میں پہنچ گئے ہیں جب مولانا قطب الدین دار العلوم اسلامیہ چکوال میں ملازم ہو کر آ گئے تھے۔ آٹھ، دس ماہ کا جو عرصہ وہاں بسر ہوا، اس میں ہمیں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مولانا اپنے فن کے ماہر استاد تھے۔ طلبہ سے پدرانہ سلوک تھا۔ علاوہ ازیں طعام اور رہائش کا بندوبست بھی تسلی بخش تھا۔ رمضان سے ایک آدھ دن پہلے مدرسہ بند ہوا تو استاد صاحبان اور طلبہ گھروں کو رُخصت ہو گئے۔ عید کے بعد تو سب آ گئے لیکن اساتذہ میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ اِسی دوران مدرسہ نعمانیہ کا ذکر ہم سُن چکے تھے۔ بھائی صاحب بھی چونکہ مولوی فاضل کے امتحان میں درجہ اوّل میں پہلے نمبر پر آئے تھے۔ یونی ورسٹی سے انھیں ۳۰ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ لاہور ہی میں مقیم تھے۔ اِن کی وساطت سے دار العلوم نعمانیہ میں داخلہ مل گیا۔ یہاں ہم نے انجمن طلبہ بنائی۔ جس میں مضمون اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ مناظرے بھی ہوتے تھے۔ یہیں برقؔ نے کچھ اُلٹے سیدھے شعر شروع کیے اور انجمن کے سالانہ

جلسے میں کچھ تقریریں بھی کیں۔ جنھیں پسند کیا گیا۔ اشعار اکثر بے وزن ہوتے تھے لیکن ابتداتھی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ اس فن میں ریاض کرتے اور کسی ماہر استاد سے مشورہ لیتے تو اِن کا شمار ملک کے مایۂ ناز شعرا میں ہوتا۔

نعمانیہ میں ٹھہر کر میں نے مولوی فاضل اور برقؔ نے منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا مَیں تو بعد از رمضان دورہ حدیث کی تکمیل کے لیے دیو بند چلا گیا اور برقؔ نے اورینٹل کالج میں مولوی فاضل کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں، مَیں فاضلِ دیو بند ہوگیا اور برقؔ نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔ اسی سال میں میونسپل ہائی سکول حضرو میں فارسی ٹیچر مقرر ہوگیا اور برقؔ اسلامیہ ہائی سکول نوشہرہ میں ملازم ہوگئے۔ وہاں انھوں نے انجمن کے ایک جلسے میں جس کی صدارت پیر سیّد جماعت علی شاہ فرمارہے تھے۔ ایک نظم بہ عنوان ''روح القدس'' پڑھی جسے بہت پسند کیا گیا۔ مَیں بھی اس جلسے میں موجود تھا، اتفاق سے ایک بند ابھی تک حافظہ میں موجود ہے۔ عرض کرتا ہوں:

جب تلک سر میں جنونِ دشت پیمائی نہ ہو
جب تلک سینے میں داغوں سے بہار آئی نہ ہو
جب تلک پاؤں میں ذوقِ آبلہ پائی نہ ہو
جب تلک ہر رگ میں شورِ محشر آرائی نہ ہو
اے رہینِ خانۂ خود یہ کبھی ممکن نہیں
تجھ کو حاصل ہو وصالِ لیلیِ محمل نشین

کچھ عرصہ کے بعد نہ معلوم کیا بات ہوئی، کہ برقؔ نوشہرہ سے گورنمنٹ ہائی

سکول راہوں، ضلع جالندھر چلے گئے۔ یہ چھ ماہ کا عارضی سلسلہ تھا، جو پلک جھپکتے گذر گیا۔ کیا زمانہ تھا، ادھر سے جواب ملا۔ ابھی گھر واپس نہیں آئے تھے کہ راستے ہی میں ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول چکوال میں جگہ مل گئی۔ جہاں وہ کافی عرصے تک مقیم رہے۔ وہاں بہت مقبول ہوئے اور بڑی شہرت پائی چونکہ بڑے خوش مزاج اور لطیف المذاق تھے، جس محفل میں جا بیٹھتے، اپنی خوش طبعی اور لطیفہ گوئی سے محفل کا پھیکا رنگ لال چہچہا کر دیتے تھے۔

ع ملتے کہاں ہیں ایسے لطیف المذاق لوگ

چکوال سے برقؔ، نارمل سکول لالہ موسیٰ بھیج دیے گئے۔ مَیں ان دنوں پنڈی گھیب ہائی سکول میں تھا۔ مجھے مڈل اینڈ نارمل سکول کیمبل پور مل گیا۔ بمشکل چھ ماہ گذرے ہوں گے کہ برقؔ بھی تبدیل ہو کر کیمبل پور آ گئے۔ مَیں ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ وہ بھی وہیں آ گئے چونکہ انسپکٹر آف سکول مسٹر لیچ وِلسن نے ڈویژن بھر کی ایس وی کلاسیں یہاں جمع کر دی تھیں اور اچھے خاصے قابل اساتذہ مختلف سکولوں سے تبدیل کر کے یہاں بھیج دیے تھے۔ اِس بنا پر اِس سکول ایک خاص امتیاز حاصل ہو گیا تھا۔ یہ عرصہ جو چار سال پر محیط ہے۔ بڑے مزے میں گذرا۔ گرمی کے موسم میں ہوسٹل کے وسیع صحن میں شام کو والی بال کا کھیل ہوتا اور بعد از نماز مغرب، اسی صحن میں نیاز فتح پوری کی نگارستان، علامہ مشرقی کا تذکرہ اور غالب کا دیوان پڑھا جاتا یا سُنایا جاتا۔ نگارستان اور دیوانِ غالب میرے سپرد تھیں اور تذکرہ برقؔ کے۔ میرا اور بعض لوگوں کا اتوار شکار کے لیے مخصوص تھا اور جب شام کو لوٹ کر آتے تو تھک کر چُور ہو چکے ہوتے اور ہر دفعہ دل میں ٹھان لیتے کہ آئندہ اِس کارِ بیکاراں کے نزدیک

نہیں جائیں گے لیکن بلامبالغہ پھر اگلے اتوار کو صبح پانچ بجتے ہی ہماری سائیکلیں حضرو جانے والی سڑک پر دوڑنا شروع کر دیتیں۔

ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا نیاز فتح پوری لکھنؤ سے اور علامہ مشرقی پشاور سے اِس ذرّہ بے مقدار کو ملنے کو تشریف لاتے تھے۔ مولانا تو ہمارے ساتھ ہوسٹل میں ہی ٹھہرے۔ دو دِن اور دو رات۔ علامہ کا قیام چونکہ بڑا مختصر تھا، ان کے لیے قاضی محمد شفیع ایڈووکیٹ کا دیوان خان مانگ لیا تھا۔ بیوی بچے ساتھ تھے۔ وہ قاضی صاحب کے زنان خانے میں چلے گئے۔ ماہ رمضان تھا۔ سب روزے سے تھے، نیاز فتح پوری کی آمد میں تو مئے وانگبیں کی لاگ شامل تھی لیکن علامہ صرف میری خاطر تشریف لائے تھے۔ اس میں میری کوئی بڑائی نہیں۔ یہ اُن کی عظمت اور جلالتِ قدر تھی۔ مَیں نے دونوں حضرات پر ایک ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔ مولانا کا مضمون اردو ڈائجسٹ میں اور علامہ کا قومی ڈائجسٹ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اگرچہ برقؔ ایف۔اے انگریزی ۱۹۲۴ء میں پاس کر چکے تھے لیکن مجھے ۱۹۲۷ء میں یہ موقع ملا۔ ۱۹۲۸ء میں ہم دونوں بی۔اے میں شامل ہوئے اور پاس ہو گئے۔ برقؔ نے ایم۔اے عربی ۱۹۳۱ء میں اور مَیں نے ۱۹۳۲ء میں اور ایم۔اے فارسی ۱۹۳۳ء میں اور برقؔ نے ۱۹۳۴ء میں پاس کرلیا۔ کچھ عرصے کے بعد برقؔ کو تبدیل کر دیا گیا چونکہ وہ وہاں سے جانا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے آٹھ ماہ کی رُخصت لے کر اسلامیہ کالج لاہور میں ایم۔اے عربی میں داخلہ لے لیا اور چونکہ کالج طلبہ میں وہ بہتر عربی جانتے تھے اس لیے درجہ اوّل میں کامیاب ہونے والوں میں اِن

کا نمبر دوسرا تھا اور ۴۰۰ سے ۳۹۰ نمبر حاصل کیے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ میں اور پھر پنڈی گھیب میں کچھ عرصہ کام کرتے رہے۔ یہ زمانہ انھوں نے بڑی پریشانی میں گذارا۔ وہ فسٹ کلاس ایم۔اے تھے اور نویں اور دسویں جماعتوں کو پڑھاتے تھے۔ ایسا زمانہ مجھ پر بھی گذرا ہے۔ مَیں ڈبل ایم۔اے ایم۔او۔ایل تھا اور مڈل جماعتوں کو پڑھاتا تھا۔ مسٹر سنڈرسن جو ملٹری سے بطور میجر ریٹائرڈ ہوئے تھے، ڈائریکٹر تھے۔ اتفاق سے ہمارے سکول آ نکلے جب ہیڈ ماسٹر نے سٹاف سٹیٹمنٹ سامنے رکھی اور میرے نام کے سامنے ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، عربی، فارسی، مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور فاضل دیوبند لکھا دیکھا تو سٹ پٹا گئے، مدہوش سے آدمی تھے لیکن یہ بات ان کے حافظے میں کلبلاتی رہتی تھی۔ دفتر سے پوچھا کسی کالج میں کوئی عربی فارسی کی آسامی خالی ہے۔ انٹر کالج گجرات کو ضرورت تھی، ۲۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو میری تقرری کے احکام آ گئے اور مجھے مڈل سکول سے نجات مل گئی۔ برقؔ چھ ماہ پیشتر ہی ہوشیار پور جا چکے تھے وہاں کے قیام سے انھوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ جم کر کام کیا اور پی۔ایچ۔ڈی ہو گئے۔

اولوالعزمانِ دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں

علاوہ ازیں انھوں نے نظم کو چھوڑ کر نثر کی طرف توجہ کی اور ''دو قرآن'' لکھنے میں کامیاب ہو گئے چونکہ کتاب کے نام میں جو ندرت تھی، اس سے زیادہ ندرت مافی الکتاب میں تھی۔ قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قیمت صرف دو روپے تھی۔ کئی ایڈیشن چھپے اور بک گئے، مصنف کو کیا ملا؟ مجھے اِن سے دریافت کرنے کا موقع

نہیں ملا۔ دو قرآن اِن کی پہلی کوشش تھی جسے توقع سے بڑھ کر پذیرائی حاصل ہوئی اور مصنف کی تمام خوابیدہ قوتیں بیدار ہوگئیں اور برقؔ کی تیز نویسی نے کتابوں کے طومار لگادیے۔

مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ مَیں برمحل اس امر کا ذکر نہ کرسکا۔ جب مَیں دیوبند سے دورۂ حدیث ختم کر کے واپس آیا اور میونسپل ہائی سکول حضرو میں بطور استاد فارسی ملازم ہوگیا تو ڈاکٹر برقؔ نے بھی ہائی سکول نوشہرہ میں فارسی استاد کی اسامی تلاش کرلی اور یوں ان کا درسِ نظامی نامکمل رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر اُن سے کہیں نہ کہیں لغزشیں ہوگئیں۔ جس زمانے سے اُن کا تعلق ہے اس زمانے میں سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں میں پروفیسروں کی فوجِ ظفر موج میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جن کے قلم سے کوئی رسالہ یا کوئی کتاب برآمد ہوئی ہو۔ گورنمنٹ کالج ہوشیار پور کے پرنسپل ڈاکٹر بھاٹیہ اور وائس پرنسپل پیر غلام وارث تھے اور ڈاکٹر برقؔ دونوں کے علمی ذوق کی تعریف کرتے تھے۔ عجب نہیں کہ ڈاکٹر برق کا خامہ فرسائی کا یہ بے پناہ ذوق انھی دو علم دوست ساتھیوں کا فیضانِ صحبت ہو۔

☆☆☆
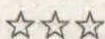
تصانیف وتالیفاتِ برق

☆ انفعال ۱۹۲۸ء ☆ پیامِ ادب ۱۹۲۹ء
☆ لمعاتِ برق ۱۹۳۲ء ☆ ابنِ تیمیہ (انگریزی) ۱۹۳۹ء
☆ ابنِ تیمیہ (اُردو) ۱۹۴۰ء ☆ حیاتِ سکندر (غیر مطبوعہ) ۱۹۴۲ء
☆ دو قرآن ۱۹۴۲ء ☆ آئینِ فطرت ۱۹۴۴ء
☆ حکمائے عالم ۱۹۴۶ء ☆ فرمانروایانِ اسلام ۱۹۴۸ء
☆ دو اسلام ۱۹۴۸ء ☆ سلاطینِ اسلام ۱۹۴۸ء
☆ جہانِ نو ۱۹۴۹ء ☆ گل ہائے ایران ۱۹۵۰ء
☆ ایک اسلام ۱۹۵۲ء ☆ حرفِ محرمانہ ۱۹۵۲ء
☆ بھائی بھائی ۱۹۵۸ء ☆ من کی دُنیا ۱۹۶۱ء
☆ اللہ کی عادت ۱۹۶۲ء ☆ دانشِ رومی وسعدی ۱۹۶۳ء
☆ یورپ پر اسلام کے احسان ۱۹۶۴ء ☆ مسائلِ نو ۱۹۶۴ء
☆ اسلام اور عصرِ رواں ۱۹۶۵ء ☆ دانشِ عرب وعجم ۱۹۶۵ء
☆ ہم اور ہمارے اسلاف ۱۹۶۶ء ☆ فلسفیانِ اسلام ۱۹۶۸ء
☆ رمزِ ایمان ۱۹۶۹ء ☆ مؤرخینِ اسلام ۱۹۶۹ء
☆ تاریخ الحدیث ۱۹۷۰ء ☆ ہماری عظیم تہذیب ۱۹۷۱ء
☆ معجم البلدان ۱۹۷۲ء ☆ معجم القرآن ۱۹۷۲ء
☆ مہماتِ رسول ۱۹۷۳ء ☆ عالمِ اسلام ۱۹۷۴ء
☆ الحادِ مغرب اور ہم ۱۹۷۵ء ☆ عظیم کائنات کا عظیم خدا ۱۹۷۶ء
☆ میری آخری کتاب ۱۹۷۷ء ☆ میری داستانِ حیات ۱۹۸۲ء
☆ مقالاتِ برق [مرتب ارشد محمود ناشاد] ☆ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط [مرتب عبدالعزیز ساحر]
☆ برقِ بیتاب [مرتب: سیّد شاکر القادری] ☆ مضامینِ برق [مرتب: کیپٹن (ر) عبداللہ خان]

☆☆☆

قرآن حکیم اور علم الآفاق

رفاہیت عالم کا بلند اسلامی وظیفہ

قرآن حکیم نے عجائبات کونیہ؛ یعنی اس سلسلۂ لیل ونہار، انقلابات موسم، پہاڑوں اور سمندروں حیوانات ونباتات وغیرہ کی طرف اتنی دفعہ ہمیں متوجہ کیا ہے اور اس قدر تاکید سے اوامر نازل ہوئے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ توجہ فی الکائنات دین قیم کا ایک زبردست پہلو ہے اور یہ فقہی مسائل اور تعزیری دفعات میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ صلوٰۃ وصوم اور زکوٰۃ، حلف وطلاق اور دیگر فقہی مسائل پر قرآن حکیم میں صرف ۱۲۵ آیات ہیں اور عجائبات علام پر ۱۰۷۵۰ اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ ارکانِ اسلام صرف پانچ ہی نہیں۔ بلکہ سات ہیں یعنی جہاد بالباطل، اور تدبر فی الآفاق اسلام کے دو اہم رکن ہیں۔ سہولت کار کی خاطر ہم دین کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔ اول علم النفس یعنی تہذیب نفس وتربیت روح کے متعلق جو احکام نازل ہوئے۔ مثلاً صوم وصلوٰۃ، زہد وتقویٰ، خیرو مروّت وغیرہ، اور دوم علم الآفاق، یعنی عوالم حیوانات ونباتات وغیرہ پر غور کرنا، آفتاب وماہتاب کی تسخیر، سمندروں پر تصرف سیر بلاد، روشنی وکہربا کے حقائق پر غور کرنا۔ عناصر اثیری کی تلاش، اثمار واشجار کی چھان بین۔ الغرض آفاق میں گہرا تدبّر، ٹھوس تعمق اور عمیق تفکر ہمارے مذہب کا جزو اعظم ہیں۔ جن کی طرف بار بار رب العرش نے ہماری توجہ کو منعطف کیا۔ بلکہ مندرجہ ذیل آیت میں علم الآفاق کو علم الانفس سے پہلے ذکر کیا ہے۔ جس سے مقدم الذکر کی فوقیت سمجھی جاتی ہے۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق والانفس

آگے دیکھئے: قل انظروا ما فی السموٰت والارض

اسلام میں جس قدر تشتت وافتراق آج موجود ہے وہ فقہی مسائل کی وجہ سے ہے۔ اگر دین اسلام کے اس اہم شعبہ یعنی علم آفاق کی طرف مسلمانانِ عالم متوجہ ہو جائیں۔ تو یقیناً تمام فرقے ان حقائق پر مجتمع ہو جائیں۔ اور اختلاف مٹ جائیں گے۔

مطالعہ فطرت کی اہمیت:

ایک بھوکا روٹی ملنے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے پیاسا پانی ملنے پر، فقیر دولت پا کر اور جاہل علم کی دولت سے بہرہ ور ہو کر، اللہ کی تعریف کرتا ہے لیکن مسلم کو یہ ہدایت کی گئی۔ کہ وہ اللہ کی محض اس لیے شکر ادا کرے کہ وہ رب العالمین ہے۔ کتنی وسیع ہمدردی کا پیام دیا گیا۔ اور پھر کس طرح قرآن کی پہلی آیات میں پیروان اسلام کو تمام عوالم پر غور وتدبّر کی دعوت دی گئی۔ کہ آج مسلمان نظام عالم وعجائبات کونیہ سے مطلقاً جاہل ہے۔ اس لیے اس کا شکریہ اور اس کی حمد ''حمد ناشناس'' ہے اگر ہمیں گوئٹے کے اشعار پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا ہو، اور اِس کی منزلت علم سے ناواقف ہوں تو اس کی تعریف بے معنی ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کتاب فطرت کے ایک ورق تک کا ہم نے آج تک مطالعہ نہیں کیا۔ رموز کائنات سے محض بے خبر ہیں تو اس کتاب کے مصنف کی تعریف کرنا بڑے بڑے ورد الاپنا محض بے معنی ہے اس لیے تو ارشاد ہوتا ہے۔

وقلیل '' من عبادی الشکور

خدا کا نام لینے والوں کی تعداد ہر زمانہ میں بہت زیادہ رہی ہے۔ ہندو، یہودی، عیسائی

اور مسلم صوفیوں کا شمار کون کر سکتا ہے۔عوام الناس کی ایک بہت بڑی جماعت ہر روز خدا کے آگے جبینِ نیاز گھستی ہے پھر خدا کا یہ فرمانا۔ کہ میرے شاکر بندوں کی تعداد دنیا میں بہت قلیل ہے۔اس کا مطلب بغیر اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ صحیح شاکر، یعنی کتاب فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد میری عظمت وقدرت کے نغمے الاپنے والے بہت کم ہیں

انما یخشی اللہ من عبادہِ العلماء

فرض کرو ایک قوم کسی منقش ومصوّر تاریک غار میں مدت سے آباد تھی۔ اتفاقاً ایک دن کسی نئے سوراخ سے روشنی اندر آ گئی۔ وہ لوگ غار کے حسن وزینت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے پھر باہر آئے۔ حسین مناظر قدرت دیکھے، جمال آفتاب و مہتاب دیکھا۔ آسمان کی خوبصورت فضاؤں میں روشن کواکب دیکھے۔ ذرا اس قوم کی مسرت وحیرت کا اندازہ کیجئے۔ یہی حال مسلمان کا ہے۔ وہ جہالت کے تاریک غار میں گرفتار ہے۔ جس دن اسے علم نصیب ہوگا۔اس راز الوہیت کے نغمے اس کے دل سے نکلیں گے۔اور آج صرف منہ سے نکل رہے ہیں۔

وکاین من آیۃ فی السمٰوات والارض یمرّون علیھا وھم عنھا معرضون

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اللہ نے آج سے کئی ہزار سال پہلے ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا،

واذ بتلٰی ابراھیم ربہ بکلمات

ابراہیم کے سامنے تمام کائنات بمعہ اپنے تمام جمیل مناظر کے ساتھ بکھری ہوئی تھی وہ

کفر و جہل کی تاریک دنیا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنے لیے معبود کا انتخاب کرنا تھا اس نے کواکب اور دیگر اجسامِ نوری کا عمیق نظر سے معائنہ کیا۔ اس کی فلک رس نگاہ ان روپہلی کھلونوں کو چیر کر بدیع السمٰوٰت تک جا پہنچی اور اعلان کر دیا۔

انی لا احب الأفلین

یہ تھی ابراہیم کی پہلی ابتلا۔ اس کے بعد تقلید و تحقیق کا درجہ آتا ہے۔ فرماتے ہیں: ارنی کیف تحی الموتی[1]۔ یہ دنیا کا بڑا محقق الٰہی صفات پر تقلید سے ایمان نہیں رکھنا چاہتا۔ آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک سائنسٹ کی طرح وہ پرندوں کا تجربہ کر رہا ہے۔

فاجعل علی کل جبلٍ منھن جزا

یہ تھی دوسری ابتلائے خلیل جس کے بعد وہ دنیا کی امامت کے لیے منتخب ہوئے۔

قال انی جاعلک للناس اماما. قال ومن ذریتی ، قال لا ینال عھدی الظالمین

وہ ظالم لوگ ہیں جو آج دنیا کی امامت سے اس لیے محروم کر دیے گئے۔ کہ وہ جاہل ہیں اور جہل بہت بڑا ظلم ہے۔

علم کائنات حقیقی علم ہے:

ہم کبھی خیر امت تھے۔ لیکن آج شر البریہ ہیں ایک معبود و غلام قوم بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح بکری کا دودھ، گوشت، چمڑا، ہڈیاں اور بال تمام فروخت کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک حاکم قوم محکوم کی تمام قوتیں اس کا سرمایہ،

اس کی معاون، اس کی زمین اور اس کا تمام ملک اپنے منافع کے لیے استعمال کرتی ہے۔تو کیا ایسی محکوم قوم خیرامت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

پہاڑوں کے سینے میں مختلف معاون اور دیگر عجائبات کا ذکر کرنے اور حیوانات کی مختلف النوع نیرنگیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد

ومن الجبال جُدَد" بیض" و حمر" مختلف الوانها وغرابیب سود. و منَ النّاس والدواب و انعام" مخلتف الوانه، کذالک کس لطیف پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے:

انما یخشی اللّٰه من عبادہ العلما

صاف صاف اس امر کا اعلان ہے کہ علم، علمِ کائنات کا نام ہے۔اور صرف یہی لوگ اللہ سے ڈر سکتے ہیں۔

تموّج ہوا کے معجزے:

آفتاب وذرہ، سیارہ وگل، مہتاب وزمین حیوانات ونباتات، بادل، ہوا، نجوم واشجار، احجار وابحار کا مادہ ایک ہے یعنی برق پارے مالیکیول۔ آؤ ایک مثال سے اس حقیقت کو واضح کریں۔ جب آدمی بولتا ہے۔تو ہوا میں تموج پیدا ہوتا ہے۔اس تموج کا نام speech یا کلام ہے۔اسی کلام سے انسانی تہذیب کے ہزار ہا علم و فنون خطبے لیکچر اور شعر پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے دنیا میں ہزاروں انقلاب آئے اور ہزاروں ہنگامے اسی تموّج نے فرو بھی کیے، اس تموّج نے دنیا کی شان قائم کی ہے۔ اس تموّج کو نکال دو۔ چڑیوں کے چہچہے، کوئل کے نغمے، عنادل کے زمزمے، پپیہے کی

پی، انسانی تغزل، نوحہ و ماتم الغرض تمام صدائیں، نوائیں، زمزمے، نغمے، قہقہے، چہچہے ختم ہو جائیں گے۔ کائنات کی یہ دلفریب بستی، اس قدر سنسان اور بھیانک ہو جائے گی کہ دنیا زہر کھا کر مر جائے گی۔ دیکھا آپ نے صرف تموّج الہوا کا دنیا پر کیا اثر ہے۔ تو جس طرح کہ اس تموّج سے تقریریں، خطبے، شعر، نوائیں، اور ہزار ہا اقسام کی صدائیں تیار ہوئیں۔ اسی طرح برقیات سے زمین و آسمان آفتاب و مہتاب نباتات و حیوانات کی مختلف دنیائیں عالم وجود میں آئیں۔

ایتھر اور قرآن:

علمائے حاضرہ کا خیال ہے اور قرآن کی ایک آیت بھی اس پر شاہد ہے۔ کہ تخلیق عالم سے پہلے تمام فضا میں دھواں تھا۔ وہی دھواں ایک ایسا مادہ تھا کہ جس سے کائنات کے مختلف مناظر تیار ہوئے۔ کائنات میں اب بھی وہ مادہ مرکب موجود ہے۔ جسے اثیر یا ایتھر کہتے ہیں۔ اثیر ایک ایسی چیز ہے جس میں ہوا کی طرح روشنی آفتاب قبول کرنے کی استعداد موجود ہے۔ اس لیے وہ نظر نہیں آتا۔ یہ اثیر ہوا اور روشنی سے زیادہ لطیف ہے۔ اس میں بجلی، ضو، حرارت وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ یہی وہ مادہ ہے۔ جس نے ابتدائی، عناصر یعنی آکسیجن، ہائیڈروجن وغیرہ پیدا کیے۔ جس طرح ہوائی تموّج سے حروف بنے اور حروف سے دنیا کی چار ہزار زبانیں تیار ہوئیں، اسی طرح ان عناصر کے تنوع سے مختلف اشیاء وجود میں آئیں۔ ان عناصر کو اللہ نے خزائن کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

قدر معلوم:

ان من شئِِ الّا عند ناخزائنه . وما نزله الا بقدرٍ معلوم

یہاں ''قدر'' کا لفظ قابل غور ہے۔اگر پانی میں آکسیجن، یا ہائیڈروجن کی موجودہ مقدار کو ذرہ بھر گھٹا، بڑھا دیا جائے۔تو وہ زہر بن جائے گا۔ایک مقررہ، معین ومناسب مقدار کے ساتھ ان عناصر کو ملا کر۔ہوا پانی اور پھل پھول وغیرہ کی لاکھوں دنیائیں بنا ڈالنا۔ایک ایسے خدا کا کام ہوسکتا ہے، جو انسانی دماغ میں نہ سما سکنے والے علم کا مالک ہو۔

• وما نزله الا بقدرِ معلوم ہمیں اس مقدار کا پورا پورا علم ہے۔

حیوانات، نباتات کے مختلف انواع ہائیڈروجن، کاربن، نائیٹروجن، اور بعض دیگر نمکوں سے بنے ہیں۔ترکیبی عناصر یہی ہیں۔صرف مقدار عناصر مختلف ہیں۔ انھی سے چار عناصر سے حیوانوں کی ہڈیاں، پٹھے، خون، نگاہ اور بال وغیرہ بنے ہیں۔اور انھی سے درختوں کے پتے، شگوفے، ٹہنیاں، خوشے، رس اور میوے تیار ہوتے ہیں۔

الکحل جو شراب کا جزو اعظم ہے۔اس میں موجود نہیں ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انگور کا شیرہ رکھ دیا جاتا ہے۔کچھ دنوں بعد ہائیڈروجن، آکسیجن اور کاربن بمقدار کثیر اس سے خارج ہو جاتے ہیں۔اور ایتھر سے الکحل ان کی جگہ لے لیتا ہے۔اس طرح خود بخود شیرہ انگور کی شراب بن جاتا ہے۔قدرت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ جو نہی کسی چیز میں کسی عنصر کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔وہ مہیا کر دیا جاتا ہے۔

کائنات کا مادہ ایتھر:

جس طرح حروف سے بہترین، اشعارِ مدحیہ تیار ہوتے ہیں اور ہجو بھی۔اسی طرح مادۂ اثیری سے باغات اور دلفریب مناظر فطرت تیار ہوتے ہیں۔اور خطرناک

و ہیبت ناک مناظر بھی۔ اگر چراگاہیں اور مرغزار مادہٴ اثیری کے انقلاباتِ شعری

ہیں۔ تو زمین شورِ مغلستان اور آبِ تلخ ہجواثیری ہے۔

ہزارہا صدائیں و زمزمے پیدا کیجیے۔ ہوا میں گھٹتا، بڑھتا کچھ نہیں، اسی

طرح اثیر میں سے بلا کسی کمی وبیشی کے یہ تمام کائنات پیدا ہو رہی ہے۔ ہوا مادہ ہے

کلام کا اور کلام میں لاکھ قسم کا تنوع کروڑوں قسم کی نیرنگیاں ہیں۔ ہوا اور ایتھر کو کلام و

کائنات کے خلق میں جو دخل ہے۔ اس کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ ہے۔

اختلاف السنہ والوان:

ومن آیاتہٖ خلق السمٰوٰت و الارض و اختلاف السنتکم و الوانکم ان

فی ذلک لاٰیٰتٍ للعلمین

اختلاف السنہ علوم ولغات کی طرف اور اختلاف الوان تنوع عناصر کی طرف

اشارہ ہے۔ یہاں اس آیت میں

عـا لـمین (بکسر لام) کے لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور غالباً قرآن میں اس رنگ کے

اندر اور کہیں استعمال نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیق عالم کا کام اور عالم وہ ہے۔ جو

کائنات پر غور کرے۔ اور حقیقی علم کتاب کائنات کا مطالعہ ہے۔

عناصر حروف کے عرف ہیں۔ جس طرح حروف سے بے شمار لٹریچر تیار ہوتا

ہے اسی طرح ستّر عناصر سے کتابِ فطرت میں بے شمار غزلیات، قصائد، عبارات و

کلمات لکھے گئے: لو کـان البـحر مدادا لکلمات ربیّ لنفد البحر قبل ان

تنفد کلمات ربی

آغاز آفرینش ان عناصر کی ترکیب سے ہُوا۔ اس آغار کی طرف توجہ کرنے کی یوں تاکید کی گئی ہے۔

قل سیرو فی الارض فانظروا کیف بداء الخلق

علم آفاق فرض کفایہ ہے:

آج سیاروں اور قطب نماؤں کی مدد سے ہم سمندروں میں سفر کرتے ہیں انھی قطب نماؤں کو قرآن نے علامات کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

وعلامات وبالنجم هم یهتدون

الغرض علم الآفاق دین مستقیم کا بہت اہم پہلو ہے۔ جس کو نظر انداز کر دینا۔ قرآن حکیم کی ۷۵۰ آیات کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ خدائی عظمت اس کی قوت تخلیق۔ جہاں آرائی، حیرت انگیز نظامِ کائنات اور محیر العقول سلسلۂ موجودات سے جاہل رہنا ہے۔ الٰہی حمد وثنا کے ترانے بغیر سمجھے بوجھے الاپنا ہے۔ ھو الذی سخرلکم البحر کی حقیقت سے غافل رہنا۔ ان فی ذلک لآیتٍ لقوم یدبرون. کی ماہیت کو نہ سمجھنا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر مسلم کائنات پر غور کرے۔ اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ دنیا میں عقول مساوی نہیں۔ اس لیے تمام سے تدبر فی الآفاق کی توقع عبث ہے۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ فرائض کی دو قسمیں ہیں: واجبہ و کفایہ۔ فرائض واجبہ ہر شخص کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اور کفایہ کو ادا کرنے کے لیے صرف ایک جماعت کا وجود ضروری ہے۔ اگر کفایہ کو ساری قوم ترک کر دے تو

معتوب و مغضوب ہے۔ تدبّر فی الآفاق فرض کفایہ ہے۔ جس کے ترک سے آج ساری قوم معتوب ہو گئی۔

علوم وفنون:

علوم وفنون کا تعلق پانچ چیزوں سے ہے:

(اول) پانی سے۔ مثلاً نمک تیار کرنا، شراب اور شربت بنانا جہازات کا استعمال

(دوم) خاک سے، مثلاً کانیں کھودنا، انہار بنانا، کوئلہ نکالنا وغیرہ

(سوم) ہوا سے مثلاً تجزیۂ ہوا، عناصر کی تحقیق، طیارے وغیرہ

(چہارم) نباتات سے، خصوصیات نباتات ''دریافت کرنا'' ادویات وغیرہ

(پنجم) حیوانات سے، اچھی نسل کے جانور پالنا، چمڑا رنگنا، پوستینیں بنانا، گوشت و ہڈی کو کسی مصرف میں استعمال کرنا وغیرہ

(ششم) اجسامِ سے علم طلب فزیالوجی۔ ہائی جین۔

(ہفتم) نفوس سے، تمام علوم عقلی و نقلی، اخلاقی و سیاسی وغیرہ۔

شریعت وطبیعت:

انسان کے کارفرما دو ہیں۔ شریعت وطبیعت، جہاں تک شریعت کا تعلق ہے۔ ہمارے پاس مکمل کتاب موجود ہے۔ کارفرما طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ گرمی، سردی سے بچنے کے لیے ہم مکانات بنائیں۔ کپڑے پہنیں۔ جوتے سئیں۔ بچوں کی پرورش کریں۔ اور دشمنوں سے بچیں۔ سائنس کی ترقی کی وجہ سے آج ہمارے دشمن بہت خطرناک ہو چکے ہیں۔ جن کے پاس طیارے ہیں گیسیں ہیں، سو سو میل تک

گولے پھینکنے والی توپیں ہیں، ٹینکس ہیں۔ اس لیے تقاضاءِ طبیعت کے ماتحت ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان دشمنوں سے بچنے کے لیے کتاب فطرت میں سے وہ نسخے سیکھیں۔ جو ہماری حفاظت کر سکیں طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہو سکتا ہے۔ اسی حفاظت طبیعی کو قوۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اعدوالهم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدّو كم

مسلمانوں کی غفلت کے نتائج:

علم الآفاق سے غفلت ہماری تباہی کا موجب بنی ہوئی ہے۔ ہمارا توازن قومی جاتا رہا عدل مفقود ہو گیا۔ صحت جسمانی و سیاسی میں اعتدال نہ رہا۔ سرحدیں غیر محفوظ ہو گئیں۔ تمام حفاظتی تدابیر خام نکلیں۔ کسی شعبۂ حیات میں استحکام نہ رہا، اگر آج ہم اپنی گمراہیوں، اور خامیوں کو تلاش کرنے کے لیے کوئی کمیٹی بٹھائیں۔ تو ہماری مساعی ضائع ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ اقتصادیات، سیاسیات، جسمانیات اور دیگر پہلو ہائے تمدن کے ماہرین ہمارے ہاں موجود نہیں، جنکی شہادتیں قابلِ اعتنا ہوں۔ یورپ میں ہر خامی کا علاج سوچنے کے لیے انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ جن کے سامنے ماہرین فن شہادتیں یعنی اپنی رائیں پیش کرتے ہیں۔ ملتِ مرحومہ میں کسی فن کے ماہر موجود نہیں۔ اس لیے اس قوم کی شہادت نا قابل اعتبار ہو کر رہ گئی۔

ملتِ بیضا کی اس دنیا میں خواری ہو گئی
اس امانت دار کی بے اعتباری ہو گئی

لتكونوا شهداء على الناس ۔ ہم تمام عالم کے لیے شاہد بن کر آئے

تھے۔ ہمیں حکم تھا کہ ہم ہر شعبہ حیات میں اس قدر مہارت حاصل کریں کہ ہماری رائے و شہادت کسی مسئلہ پر آخری ہو۔ لیکن صد حیف، کہ جہالت کی وجہ سے ہماری شہادت مردود ہو کر رہ گئی۔ فا عتبر یا اولی الابصار

دین و دنیا کا امتیاز:

حصول علم کے لیے قرآن و حدیث نے مسلسل احکام نافذ کیے ہیں۔ کیا وہ علم فقہ کا علم ہے جس میں چند جزئیات شریعت سے بحث کی جاتی ہے؟ کیا آج ہمیں اہلِ منطق و فلسفہ، ماہرین نحو و ادب کی ضرورت ہے؟ ہاں ان کی بھی ضرورت ہے، لیکن حقیقی علم، علم کیمیا و کہربا، علم برق وضو۔ علم معاون و حشرات، نباتات و حیوانات، اقتصادیات و سیاسیات، علم فلکیات و طبیعات، علم جرِ ثقیل و مدنیات ہے۔

بعض متصوّف علما یہ کہا کرتے ہیں، کہ یہ سب علوم دنیا ہیں۔ اور مقدم الذکر علوم دین اور دین کو دنیا پر ہر رنگ میں ترجیح حاصل ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ دنیا و دین کی یہ تمیز سب سے بڑی اصولی غلطی ہے۔ دین کا منشا ہی یہ ہے کہ ہم دنیا میں رہنے کے قابل ہو جائیں۔ جب انسان دنیا کو آباد کرنے کے لیے آیا ہے۔ تو پھر دنیا سے اعراض کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر دنیا سے اعراض ہی مقصود تھا تو پھر انسان کو دنیا میں پیدا کرنا کہاں کی دانائی تھی۔ آخر یہ بھی سوچیے۔ کہ دنیا ہے کیا چیز۔ ماں، باپ، اولاد، ہمسائے، زمین و آسمان، ہوا، سیارے وغیرہ وغیرہ والدین سے احسان کرنا، بچوں کو پالنا، ہمسایوں کی مدد کرنا، بنی نوع انسان کی خیر خواہی، کائنات کے راز دریافت کرنا، یہی دین ہے اور دنیا بھی یہی پھر یہ تمیز کیسی۔ اگر ہل جوتنا، تجارت کے

لیے سفر کرنا گناہ نہیں، تو برق و کہربا پر توجہ دینا اور عمل خدا کو سمجھنا کیوں گناہ ٹھہرا۔

منصب رفاہ عالم:

الغرض بھوائے کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس ۔ہم دنیا کی رفاہیت کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔لیکن آج پشتِ زمین کا بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ہم ظلمت گاہ میں آفتابِ عالم تاب بن کر آئے تھے۔

لیکن آج ہماری دنیا تاریک ہو رہی ہے۔ ہم سیاسیات و دینیات میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے آئے تھے۔لیکن آج مکتبِ فطرت میں ہماری حیثیت ایک طفل ابجد خوان سے بھی کم ہے۔ہم ظلم و جہل کی بنیادوں کو متزلزل کرنے آئے تھے۔لیکن اس عفریت اقوام برافگن کا پہلا شکار خود ہوئے۔

اور نہ نتیجہ یہ ہوا۔

فبعثنا علیھم رجالاً اولی باسٍ شدید فجا سو خلل الدیار و کا ن وعداً مفعو لا .

[مطبوعہ: درسال نامہ انقلاب ______ ۱۹۳۹ء]

☆☆☆

آئینِ فطرت

کائنات کے ہر شعبے میں ایک آئین کام کر رہا ہے۔ سورج، روشنی، طاقت اور زندگی دے رہا ہے۔ نباتات مدارِ حیوانات بنے ہوئے ہیں۔ لیل و نہار کا سلسلہ ایک باقاعدگی کے ساتھ قائم ہے۔ بہار و خزاں کے موسم وقتِ معیّن پر آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ آسمان پر سیّارے اپنی اپنی گذرگاہوں پر ہول ناک تندی کے ساتھ چکّر کاٹ رہے ہیں اور کہیں تصادم نہیں ہوتا۔ پانی ہر طرف پستی کی طرف جا رہا ہے۔ زمین میں ازل سے کشش ہے۔ ثمر و اشجار ابتدائے آفرینش سے وقت پر پھل دے رہے ہیں۔ برسات میں سہانے بادلوں کی دنیا مدت سے تعمیر ہو رہی ہے۔ شہد کی مکھی لا تعداد زمانوں سے شہد تیار کر رہی ہے۔ بھونرا ازل سے پھولوں کا طواف کر رہا۔ الغرض کائنات کا ہر ذرہ ایک دستور العمل کو نباہ رہا ہے۔ نہایت باقاعدگی سے نباہ رہا ہے، چارو ناچار نباہ رہا ہے۔ طوعاً و کرہاً نباہ رہا ہے۔ مشیّت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے نباہ رہا ہے۔ سرتاپا تعمیل و عبودیت بنا ہوا ہے۔ بے چارگی و بے کسی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ پورا عابد، مومن، ساجد اور مسلم بنا ہوا ہے۔

اَفَغَیرَ دِینِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ○

کیا یہ لوگ مشیتِ ایزدی و عاداتِ الٰہیہ کے بغیر کوئی اور مذہب (دستور العمل) چاہتے ہیں؟ کیا انھیں نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ہر چیز قانونِ الٰہی پر ایمان لا کر چارو ناچار مسلم ہو چکی ہے اور تمہاری بازگشت بھی اللہ ہی کی طرف ہو گی کسی اور آئین کو بقاو

دوام حاصل نہیں۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَا لْاَرْضِ

کائنات کی ہر چیز خدائی دین کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔

وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّ الْمَلٰئِکَۃُوَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَo یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُئوْ مَرُوْنَo

زمین وآسمان کی تمام مخلوق، کیا چوپائے، اور کیا فرشتے، اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم ہیں۔ نافرمانی اور بغاوت کا خیال تک ان کے دماغ میں نہیں آتا (وھم لا یستکبرون) وہ اللہ کی انتقامی طاقتوں سے ڈرتے ہیں اور اسی لیے سرگرم عمل ہیں۔

زمانہ باوجود کہن سالی کے کیوں جوان ہے؟ باغوں اور جنگلوں سے شباب کیوں چھلک رہا ہے؟ آفتابوں اور ماہتابوں سے نور کیوں بہ دستور بہ رہا ہے؟ پہاڑوں کی ہیبت اور عظمت کا کیا راز ہے؟ سمندروں میں ہولناکیاں کیوں باقی ہیں؟ ساون کی سانولی گھٹاؤں، مہتاب کی پرسکون چاندنی اور سکوتِ صحرا میں لذتِ موسیقی، شباب اور حسن کیوں خیمہ زن ہیں؟ ہاں! ہاں! یہ دنیا کیوں سال خوردہ نہیں ہوتی؟ اس میں کہنگی، بوسیدہ پن اور اضمحلال کی علامات کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ سمندر کے ساکن پانی میں کیوں تعفن پیدا نہیں ہوتا؟ ہمالہ اور البرز کی دیواریں کیوں شکستہ نہیں ہوتیں؟ ان سوالات کا جواب صرف ایک ہے کہ یہ سب چیزیں دینِ الٰہی پر قائم ہیں، ساجد و عابد ہیں، خاضع و خاشع ہیں، مومن و مسلم ہیں اور الٰہی عادت یہ ہے کہ وہ مسلم کو باقی رکھتا ہے اور غیر مسلم کو میٹ دیتا ہے۔

وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکَافِرِیْنَ

اور الٰہی قانون سے ہٹنے والوں کی جڑیں کاٹ دی جاتی ہیں۔

زمین و آسمان کی ہر چیز اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، عمل کر رہی ہے، مشیتِ الٰہی کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ صرف ایک مخلوق ہی ایسی ہے، جسے الٰہی قہر و غضب کی پرواہ نہیں، دستور العمل پر عمل کرنے کی فکر نہیں۔ گذشتہ اقوام سے سبق حاصل کرنے کا دماغ نہیں۔ اس نافرمان، سرکش اور سنت الٰہیہ کو بار بار چھوڑنے اور ہلاک ہونے والی مخلوق کا نام انسان ہے۔ ویقطع دابر الکافرین

اور الٰہی قانون سے ہٹنے والوں کی جڑیں کاٹ دی جاتی ہیں۔

آیتِ امانت کی تشریح:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۝

مولوی اس آیت کے معنی یوں بیان کرتا ہے:

''ہم نے اپنی امانت ارض و سما اور پہاڑوں کو پیش کی، ان سب نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے، تو اسے انسان نے اٹھالیا کہ انسان ظالم اور جاہل تھا۔''

ان معنوں پر کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں:

اوّل: زمین اور آسمان کو کیسے جرات ہوئی کہ اللہ کی پیش کردہ امانت کو لینے سے انکار کر دیں؟ کیا یہ نافرمانی، سرکشی اور بغاوت نہیں؟ پھر خدا نے ایسے نافرمانوں کو سزا کیوں نہ دی؟ کیا معاذ اللہ خدا ڈر گیا تھا کہ کہیں بغاوت نہ کر دیں؟

دوم: یہ معنی سارے قرآن کی تردید کرتے ہیں۔ ہم ابھی چند آیات درج کر

چکے ہیں کہ ہر چیز اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگی ہوئی ہے۔ ولہ اسلم الخ (ہر چیز مسلمان ہے) ویفعلون ما یومرون (ہر چیز تعمیل حکم کر رہی ہے) ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے زمین اور آسمان کو کہا کہ آؤ! اور اپنا کام طوعاً و کرہاً شروع کرو:

قَالَتَا اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ

تو زمین و آسمان نے کہا کہ ہم ایک مطیع و فرماں بردار غلام کی طرح حاضر ہیں۔

ان آیات کی موجودگی میں یہ معنی کرنا کہ "اِن سب نے امانت اٹھانے سے انکار کر دیا" جہاں قرآن میں تناقض و تعارض پیدا کرتا ہے۔ وہیں زمین و آسمان کی اطاعت و عبودیت پر ایک خوف ناک الزام ہے۔

سوم: یہ معنی خلافِ حقیقت ہیں، اس لیے کہ جب کائنات کی ہر چیز اپنے فرائض میں محو ہے تو یہ کہنا کہ ارض و سما نے امانت کے لینے سے انکار کر دیا، کذب و خلاف واقعہ ہے۔

چہارم: اچھا، دو لمحوں کے لیے مان لیجیے کہ زمین و آسمان نے امانت لینے سے انکار کر دیا اور اللہ میاں حیران تھے کہ اب کیا ہوگا؟ تو (خاکم بدہن) انسان کو اللہ کی بے بسی پر رحم آیا۔ ایک کونے سے اٹھا، میدان میں آیا اور للکار کر کہا کہ "اے رب! تیری امانت میں اٹھاؤں گا" انسان کو اس وفاداری اور الٰہی صدا پر لبیک کہنے کا انعام یہ ملنا چاہیے تھا کہ اللہ میاں یوں فرماتے کہ "اے انسان" تو بڑا نیک، شریف اور بھلا مانس ہے اور اپنے آقا کا جاں نثار و وفادار نوکر ہے۔ جا میں نے تجھے زمین و آسمان کے خزائن دے دیے" لیکن

بجائے تحسین و آفرین کے انعام ملتا ہے کہ

حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. اَنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً.

اور انسان نے وہ امانت اٹھالی، اس لیے کہ وہ بڑا ظالم اور احمق تھا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک کمانڈر فوج کو حکم دیتا ہے کہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر دشمن کے چار آدمی بیٹھ کر گولیاں برسا رہے ہیں۔ تم میں سے جو شخص جان پر کھیل کر ان کی جان لے گا، وہ حکومت کے خزانۂ عامرہ سے انعام پائے گا۔ تمام سپاہی خوف کے مارے کانپ رہے ہیں۔ ہر طرف افسردگی، خوف اور گھبراہٹ محیط ہے کہ عین اس عالم میں ایک نوجوان آگے بڑھتا ہے۔ بندوق کے دستے پر ہاتھ مار کر سلام کرتا ہے اور اپنی جان پیش کر دیتا ہے۔ بعد میں کمانڈر یہ واقعہ اہلِ ملک کو ان الفاظ میں سناتا ہے کہ: تمام فوج ڈر سے کانپ رہی تھی کہ ایک جوان آگے بڑھتا ہے، اپنی قوم اور مادرِ وطن کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ یہ جوان بڑا موذی (ظالم) اور پاجی (جاہل) ہے" ______ جس طرح واقعہ غیر فطری ہے، اسی طرح وہ مولویانہ معنی بھی غلط اور غیر قدرتی ہے۔

صحیح تفسیر:

اس آیت میں صرف "حَمَلَ" کا لفظ تشریح طلب ہے۔ قاموس فیروز آبادی میں لکھا ہے حَمَلَ خَانَ (خیانت کی) تو صحیح معنی یہ ہوں گے۔ ہم نے ارض و سما وغیرہ کے سامنے ایک نظامِ حیات (امانت) ایک آئین و دستور العمل (امانت) پیش کیا، ایک امانت پیش کی۔ زمین و آسمان اس دستور العمل کو نباہنے میں محو ہو گئے اور خلاف ورزی کے نتائج سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے الٰہی امانت میں خیانت کی

(حَمَلَهَا الْاِنْسَان) احکامِ الٰہی ومشیت خداوندی کے قانون کو توڑا (حَمَلَهَا الْاِنْسَان) یہ کیوں؟ اس لیے کہ انسان ظالم اور جاہل تھا"

یہ معنی نہ تو دیگر آیاتِ قرآن کے متناقض ہیں اور نہ خلافِ واقعہ، کیوں کہ انسان کی نافرمانی کی داستانوں سے سارا قرآن معمور ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْد"

• اس آیت میں دو حرف تحقیق ہیں اِنَّ اور ل: ترجمہ یہ ہوا کہ "تحقیق انسان اپنے رب کا یقیناً نافرمان ہے۔"

وَالْعَصْرِ . اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥

سارا زمانہ شاہد ہے کہ انسان اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے۔

وَقَلِیْل" مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْر. فرماں بردار بندوں کی تعداد بہت کم ہے

منتہی الارب میں درج ہے۔

"وقولہٖ تعالیٰ فابین ان یحملنہاو حملہا الانسان" یعنی ابا کردند از خیانت کردن، در امانت وخیانت کرد آں را انساں"

رجوع بہ مطلب:

ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ اسلام انسان کا فطری مذہب ہے اور عروج وتکمیل کا قدرتی (نیچرل) طریقہ ہے۔ انسان کی شخصی واجتماعی حیات کی تکمیل اسلام کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اگر پرندہ پروں کے بغیر اڑ سکتا ہے۔ اگر بجائے شکمِ مادہ کے شکمِ نر سے بچہ پیدا ہوسکتا ہے، اگر پتھر ہوا سے ہلکا ہوسکتا ہے۔ اگر لوہا پانی پر تیر سکتا ہے،

الغرض اگر کسی پہلو میں بھی فطرت کی مخالفت کی جا سکتی ہے تو پھر یقیناً ایک قوم اسلام کے بغیر بھی حقیقی ترقی کر سکتی ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو یاد رکھو کہ اسلام کے بغیر عروجِ ملی و شخصی ناممکن ہے۔

ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہے۔ یہ نتیجہ ہمارا اور تمہارا پیدا کردہ نہیں، بلکہ الٰہی تخلیق ہے۔ تصادم کا نتیجہ چوٹ، مہینوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے رکھنے کا نتیجہ ہاتھ کا سوکھ جانا، آگ میں گرنے کی نتیجہ جلنا اور پانی میں گرنے کا نتیجہ بھیگنا ہے۔ ورزش کرنے والے تندرست رہتے ہیں اور کاہل، بیمار۔ کھلی ہوا میں پھرنے والے صحت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور غلیظ و متعفن و تنگ کمروں میں رہنے والے گرفتارِ امراض ہوتے ہیں۔ مکھن کھانے والے اور دودھ پینے والے، سوکھی روٹی کھانے والوں سے زیادہ تندرست ہوتے ہیں۔

چند سوالات:

کیا دنیا میں کوئی ایسا فرد ہے جو مذکورہ بالا نتائج سے بچ سکے؟ کوئی ہے، جو پانی میں گر کر نہ بھیگے؟ کوئی ہے جو زہر کھا کر نہ مرے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ قطب مینار سے مسلمان کودے اور بچ جائے لیکن ہندو مر جائے؟ کیا یہ ممکن ہے ایک تولہ سنکھیا کھا کر مسلمان تو بچ جائے، مگر ہندو ہلاک ہو جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ورزشی ہندو کی صحت اس لیے خراب ہے کہ وہ ہندو ہے، اور ایک کاہل مسلمان کو صحت کا انعام اس لیے دیا جائے کہ وہ بڑے ادب سے کلمہ شریف پڑھ سکتا ہے؟ اگر یہ سب کچھ ناممکن ہے اور قطعی ناممکن ہے، تو یاد رکھو کہ زمین سے لے کر آسمان تک اسباب و علل کا ایک مستحکم سلسلہ کام کر رہا ہے۔ اعمال و نتائج کا ایک یقین انگیز جال بچھا ہوا ہے۔ کسی عمل کو کوئی کرے۔ چاہے ہندو ہو یا مسلمان، یہودی ہو عیسائی، لازماً نتیجہ مرتب ہوگا۔ اتفاق و اتحاد پیدا کر کے ہر قوم طاقتور اور توانا بن سکتی

ہے۔ دیانت وراستی سے ہر قوم یا ہر فرد کی ساکھ قائم ہو سکتی ہے، بدخلقی وترش روئی ہر آدمی کو قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ محبت، ہمدردی اور حسنِ اخلاق کی ہر جگہ تعریف ہوتی ہے۔ قمار بازی، شراب خوری، زنا، اغلام اور چوری ہمیشہ تباہی کا باعث بنتے ہس۔ میرا یہ محکم یقین ہے کہ کوئی آدمی کسی مذہب، عقیدہ یا فرقہ کا ہو، اگر وہ حیادار ہے، تو اسلام کے ایک اصول پر عمل پیرا ہے، اگر وہ ہمدرد، مخیّر، نیک چلن اور نیک طینت ہے، تو اس کے اندر اسلامی اخلاق موجود ہیں۔ اور وہ اپنے نیک اعمال کا اجر پائے گا۔ چور، بدکار اور ٹھگ کسی فرقے یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، ذلت اٹھائے گا۔ دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوگا۔ اس لیے مجھے یہ اعلان کرنے میں قطعاً باک نہیں کہ اسلام کوئی فرقہ نہیں، بلکہ یہ ایک عالمگیر سچائی ہے۔ ایک بین الاقوامی صداقت ہے (INTERNATIONAL TRUTH) ہے۔ وہ لوگ نیم مسلمان ہیں، جو قوانین فطرت کے کسی حصے پر عمل کر رہے ہیں۔ خواہ وہ عیسائیت و یہودیت سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ نیم کافر ہیں، جو مشیت الٰہی کے درس کے کسی حصے کو بھول کر ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اسلام کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ بہت سے قومیں، جن کے نام کچھ اور ہیں، اپنے بعض خصائص کے لحاظ سے مسلمان ہیں۔ بہت سے مسلم جن کے نام عبداللہ و عبدالرحمٰن ہیں اور اعمال و اخلاق کے لحاظ سے ننگِ انسانیت ہیں، وہ غیر مسلم ہیں۔

[مطبوعہ: البیان ــــــ امرتسر؛ شمارہ مئی ۱۹۴۰ء]

☆☆☆

مسلمانوں کی عالم گیر غلط فہمی

جب پیروانِ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں اباطیل وخرافات کو داخل کرلیا، جب اسلام کے اصلی نصب العین، یعنی انفرادی حیات کی تکمیل و تمکن فی الارض پر اقوال وعقائد کے پردے پڑ گئے اور جب مسلمان بے عمل، سست گام و بدکردار بن گئے، تو فطرت کی منتقمانہ طاقتیں جنبش میں آئیں، جزاوسزا کا آئین عمل میں آیا اور فلکِ نیلوفری کی ایک ہی گردش نے ہمیں پیس کر رکھ دیا۔ آج ہمارا سیاسی اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ معاشری اور تمدّنی وجاہت کا جنازہ نکل گیا ہے۔ ذلت اور فاقہ مستی کے بھنور میں سفینۂ ملّت چکّر کھا رہا ہے۔ ادبار وفلاکت سر پر منڈلا رہے ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکّاری، بے حسی اور بداعتمادی ہماری نس نس میں سرایت کر چکی ہے۔ جنگ و جدل، کینہ پروری وباہم آویزی ہمارا وطیرہ ہو چکا ہے۔ ہم ہر پہلو، ہر شعبے اور ہر محکمے میں ذلیل ورسوا اور ناکام ونامراد ہو چکے ہیں۔ ہماری بدمعاملگی، دروغ بافی اور فریب دہی کے بازاروں میں چرچے ہیں۔ لوٹ مار، قمار بازی، شراب نوشی اور دیگر جرائم کے محافل میں افسانے ہیں۔ زمین وآسمان سے انس وجان سے، خدا اور اس کے ملائکہ سے ہم پر پھٹکار برس رہی ہے اور چپ وراست سے یہ صدا آرہی ہے:

کہ کل کون تھے، آج کیا ہو گئے تم؟
ابھی جاگتے تھے، ابھی سو گئے تم؟

اس رسوائی وناکامی، اس ذلّت وپستی کے باوجود ہم اپنے آپ کو خیر سے خیر الامم سمجھے بیٹھے ہیں۔ انتم الاعلون کی بلندیوں سے گر کر ثم رددناہ اسفل

سافلین کے گڑھے میں پہنچ چکے ہیں۔ لیکن بہ دستور اشرف الامم ہونے کا دعویٰ ہے۔
ہم کبھی گذرگاہِ حیات پر مینارِ رشد وہدایت تھے اوراب او لئک کالا نعام بل هم اضل
کی ذیل میں آچکے ہیں، لیکن غرورِ تقدّس ونخوتِ صالحیت دماغوں میں ہنوز باقی ہے۔
یہ وہ مرض ہے، جو دنیا میں ہر قوم کو لاحق ہوجاتا ہے۔ شروع شروع میں ایک
قوم کو اس کے بہترین عمل کی وجہ سے پیمبرِ وقت دنیوی واخروی فلاح کی بشارتیں سناتا
ہے۔ یہ بشارتیں نسلاً بعد نسل اخلاف تک چلی آتی ہیں، حالاں کہ صحیح عمل مدت سے
مفقود ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ یہود دنیا میں خیر الامم کہلاتے تھے:
يَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاِنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِیْن.
اے یہود! میرے انعامات کو یاد کرو کہ میں نے تمھیں افضل النّاس بنا دیا تھا۔
تقریباً چودہ سو سال گذرنے کے بعد "وَلَهُم فی الدنيا خزی ولهم فی الاٰخره
عذاب" عظیم (دنیا میں سیاہ رو اور آخرت میں عذاب الیم کا شکار ہوگئے) کا اٹل
فیصلہ ان کے حق میں صادر ہوا۔ لیکن یہ لوگ بہ زعمِ خود بہ دستور مقدس، راست باز اور
جنت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔
وقالو لن يد خل الجنته الّا من كان هودا ًاوْ نصارىٰ تلك امانيهم.
قل هاتو برهانكم ان كنتم صٰدِقين.
وہ کہتے ہیں: جنت میں صرف یہود یا نصارٰی داخل ہوں گے۔ یہ تصور غلط فہمی کا نتیجہ
ہے، انھیں کہ دے کہ اگر یہ سچے ہیں، تو دلیل پیش کریں۔
حضرت مسیح کے بعد نصارٰی سے یہود سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ ہر دو خیر الامم بن

بیٹھے اور ایک دوسرے کو غلط کار، جھوٹا اور جہنمی سمجھنے لگے:

وقالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شئٍ . وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شئٍ . و ھم یتلون الکتٰب.

یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ گمراہ ہیں اور نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہود کج رو ہیں، حالاں کہ ہر دو کتاب پڑھتے ہیں۔

کیا آج مسلمان کا یہی حال نہیں؟ مسلم یہود کو، یہود و نصاریٰ کو، تمام مل کر ہندوؤں کو، اور ہندو تمام عالم کو جہنمی کہتا ہے۔ یہ ایک دماغی، روحانی اور اخلاقی مرض ہے، امتِ مسلمہ کو اللہ نے اس مرض سے بچانے کے لیے یہ آیات نازل فرمائی تھیں، لیکن اندھا اور بہرا مسلم نہ سوچتا ہے، نہ سمجھتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے اور کفر کا کیچڑ تمام جہان پر اچھال رہا ہے۔

مئوخر الذکر آیت کے ساتھ ہی یہ ٹکڑا بھی ہے۔

کذلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم

ترجمہ: اسی طرح دیگر جاہل اقوام بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ہم نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خدا صرف ہمارے لیے ہے۔ اس کی تمام نعمتوں کے مستحق صرف ہم ہیں۔ وہ دیگر اقوام کی غلطیوں کو معاف نہیں کرتا۔ ان کے نیک اعمال کو بھی غارت کر دیتا ہے اور ہماری بڑی سے بڑی بدعملی کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہم کاہل رہیں، سست اور نکمے بن جائیں، عیاشی کریں، شراب پیئں، جوا کھیلیں، تنظیم و وحدت سے الگ رہیں، جو جی میں آئے کریں اور کہیں، لیکن اللہ میاں محمد عربیؐ کی امت کو سزا نہیں دیتا، اس ماں کی طرح جو بگڑے ہوئے اور تباہ شدہ بچے سے بھی

پیار کرتی ہے۔ وہ امت محمد ﷺ سے پیار کرنے پر مجبور ہے۔ ہم اپنی خوف ناک سے خوف ناک بدعملی کے بعد بھی بہ فحوائے:

من قال لا اله الّا الله فقد دخل الجنة

جنت میں پہنچ جائیں گے۔ شبِ معراج کو خدا نے رسول ﷺ سے کہہ دیا تھا۔ تیری امت کے تمام گناہ بخش دیے گئے۔ اگر کوئی بدکار جہنم میں جا ہی پہنچا۔ تو رسول ﷺ شفاعت سے چھڑالائیں گے۔ مسلمان پر آتش جہنم حرام ہے اور بعض کلمہ گو جہنم میں صرف چند روز رہیں گے اور بس۔ مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو بھی یہی دھوکا ہو گیا تھا۔

وقالو لن تمسنا النار الا ایا ما معدودةً. قل اتخذ تم عند الله عهدًا فلن يحلف الله عهدهٗ ام تقولون على الله مالا تعلمون.

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہمیں جہنم میں صرف چند دن رہنا پڑے گا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس اللہ کی کوئی تحریر موجود ہے کہ جس کی خلاف ورزی نہ ہوگی یا خدا پر الزام لگا رہے ہیں؟

مولوی کہتا ہے کہ یہ آیات صرف یہود و نصاریٰ کے متعلق ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ کاش! اسے معلوم ہوتا کہ قرآن حکیم بے شمار آیات مخصوص واقعات اور خاص اقوام کے متعلق نازل ہوئیں۔ لیکن دراصل یہ ایسے قوانین ہیں جن کا اثر عالم گیر ہے۔ کسی قوم کی بدعملیاں اور اس کے اعمال کے نتائج اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان بھی اس غلط راہ پر چل پڑا، تو وہی نتائج مرتب ہوں گے قوم لوط کو لواطت کی وجہ سے تباہ کیا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر مسلمان اس جرم کے مرتکب ہوئے تو انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ ابولہب کی گردن میں اذیتِ رسول ﷺ

کی وجہ سے عذاب الٰہی کی رسی ڈالی گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی اور انسان اس جرم کا ارتکاب کرے، تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

اگر یہود و نصاریٰ کو اللہ نے اس غلط فہمی پر کہ بہ زعمِ خود صرف وہی جنت کے مستحق ہیں۔ تنبیہ کی ہے اور ان کی اس کج فہمی کو واضح کیا ہے، تو مسلمانوں کو اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس! مشرق سے لے کر مغرب تک یہ مرض پھیل چکا ہے۔

ومنهم اميون لا يعلمون الكتب الا امانى و ان هم الا يظنون

ان سے بعض قطعی جاہل ہیں، جو نارو اآرزوؤں اور غلط فہمیوں کا شکار اور گرفتارِ ظن و گمان ہیں۔

اگر اہل کتاب کو ان خود ساختہ امانی پر غرور تھا، تو آج مسلمان کئی قدم ان سے آگے نکل چکا ہے۔

وغرهم فى دينهم ما كانو يفترون

انھیں اپنی مکاری، افتراپردازی اور فرضی عقائد کا گھمنڈ ہے

دنیا میں ایک سلسلۂ قوانین سرگرمِ عمل ہے اور کسی قوم یا فرد کی نیکی و بدی کا معیار یہی سلسلہ ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا بہت بڑی حماقت ہے۔ بدی کی ہر جگہ اور ہر قوم میں سزا ہے اور نیکی کی ہر جگہ جزا ہے۔ یہ فرض کر لینا کہ خدا صرف ہمارا ہے۔ بہت بڑا دھوکا اور فریب خوردگی ہے۔

ليس بامانيكم و لا امانى اهل الكتب من يعمل سوءً يجز به

تمہاری تقدیروں کا فیصلہ آرزوؤں اور غلط اندیشیوں کے مطابق نہیں ہوگا۔ بلکہ اعمال

کے مطابق ہوگا اور ہر بدی کی سزا فوراً ملے گی۔

ہمیں مولوی کہتا ہے کہ ہم زبانی زبانی لَا اِلٰـہَ پڑھتے ہیں، امت محمد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، درود شریف کا ورد کرتے ہیں، جنت و جہنم کے قائل ہیں۔ اس لیے ہم پاک ہیں اور دیگر اقوام نجس، غلیظ اور ناپاک ہیں، اس فریب کی دھجیاں رب العرش نے یوں بکھیری ہیں:

الم تر الی الذین یز کون انفسھم . بل اللہ یز کی من یشاءُ و لا یظلمون فتیلاً.

ذرا ان لوگوں کی طرف تو دیکھو، جو اپنے آپ کو (بلا وجہ) مقدس سمجھتے بیٹھے ہیں۔ حالاں کہ مقدس وہ ہے، جسے اللہ پاک کرے (یعنی پاکیزگی نیک اعمال کا نتیجہ ہے) اور مکافات عمل میں ہم ذرہ بھر ظلم نہیں کرتے۔

ابتدائے آفرینش سے ایک آئین، انسانی دنیا میں کام کر رہا ہے، جس کا نام قانون عروج و زوال یا اسلام ہے جو قوم اس آئین پر عمل پیرا ہو جاتی ہے، وہ اللہ کی محبوب بن جاتی ہے اور جو اس سے دور بھاگتی ہے، اسے میٹ دیا جاتا ہے، کلدانی و آشوری، عاد و ثمود، مصری و بابلی، ایرانی و عربی، ہندی و چینی جب تک اس آئین پر عمل پیرا رہے، ان پر انعاماتِ الٰہی کی بارشیں چھما چھم برسیں۔ وہ دنیا میں معزز موقر کہلائے، جنت ارضی و اخروی کے حق دار ٹھہرائے گئے، لیکن جوں ہی ان کے قدم جادۂ مستقیم سے ہٹے، وہ یوں پیس دیے گئے کہ اوراقِ تاریخ میں افسانہ بن کر رہ گئے۔ اللہ اقوام کو میٹنے میں بہت بے نیاز ہے:

الم یرو کم اھلکنا من قبلھم من قرنٍ مکنّاھم فی الارض مالم نمکّن

لکم و ارسلنا السماءَ علیهم مدراراً. و جعلنا الانهار تجری من تحتهم فاهلکنهم بذنوبهم و انشانا من بعدهم قرناً اخرین.

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان اقوام سے پہلے کیسی کیسی اقوام تباہ کر ڈالیں۔ ہم نے ان اقوام کو وہ جاہ و جلال دیا تھا، جو تمہیں حاصل نہیں۔ ان پر چھما چھم بارشیں برستی اور ہر طرف نہریں بہتی تھیں، لیکن ہم نے انھیں بد عملی کی وجہ سے مٹا کر ان کا وارث دیگر اقوام کو بنا دیا۔

اگر یہودی کسی وقت اللہ کے ہاں افضل الناس تھے۔ اگر اصحاب الایکہ و اصحاب الرس محبوب خدا تھے اور اور بد عملی کی وجہ سے مغضوب و معتوب ہو کر رہ گئے تو پھر آج بد عمل مسلمان کو اپنے تقدس پر غرور کیوں ہے؟ وہ اپنے آپ کو کیوں خدا کا لاڈلا سمجھتا ہے؟ اسے کیوں دھوکا لگا ہوا ہے کہ خدا صرف میرا ہے اور میں اس کا۔ قرآن حکیم میں بیسیوں تباہ شدہ اقوام (جو کبھی خدا کی لاڈلی تھیں) کے حالات پڑھنے کے بعد اس کے فریب کا پھندا کیوں نہیں ٹوٹتا؟ دھوکے کا پردہ آنکھوں سے کیوں نہیں اٹھتا؟ اسے کیوں دکھائی نہیں دیتا کہ خدا اقوام کو مٹانے میں نہایت بے نیاز ہے۔

وان کفرتم فان اللہ لغنی عن العالمین

اگر تم سیدھی راہ سے بھٹک گئے، تو یاد رکھو، اللہ اقوام عالم سے بالکل بے نیاز ہے!

وہ سر پر رومی ٹوپی، چوٹی یا عمامہ دیکھ کر لحاظ نہیں کرتا، وہ عبداللہ و عبدالرحمٰن کے ناموں سے خوش نہیں ہوتا، وہ جھوٹے، بے اثر محض لایعنی عقائد کو نہیں دیکھتا، دنیا دارالعمل ہے۔ صرف عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ جو قوم جتنا عمل کرے گی۔ اتنا ہی بدلہ پائے گی۔

فمن یعمل مثقال ذرۃٍ خیراً یرہ'. وجن یعمل مثقال ذرۃٍ شراً یرہ'.

ذرہ بھر نیکی یا بدی کی جزا و سزا مل کر رہے گی

کبھی وہ وقت تھا کہ ہم بر و بحر کے مالک تھے۔ سمندروں پر ہماری حکومتیں تھیں۔ چین سے ہسپانیہ اور بغداد سے مدراس تک ہمارا علم لہرا رہا تھا۔ ہماری امانت و دیانت، راست گوئی و راست بازی کی ہر طرف دھوم تھی۔ ہمارے عدل و انصاف کے ارض و سما میں چرچے تھے۔ ہماری جان بازی و جاں فروشی کے کائنات میں غلغلے تھے۔ ہم ہر جگہ سرفراز تھے، کامیابیاں ہمارے جلو میں، سعادتیں ہماری ہم دم، بخت و اقبال ہمارے ہم رکاب اور سلطنت و امامت ہمارے طرہ ہائے امتیاز تھے۔ ہمارے بے پناہ عزم اور ہمالہ برافگن ہمت کے سامنے سمندروں کے دل دہل جاتے تھے۔ ہماری نگاہیں اقوامِ عالم کی تقدیریں پلٹ دیتی تھیں۔ ہماری چتون کا ایک شکن جبار قہرمانوں کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔ ہماری صدا سے دشت و جبل گونج اٹھتے تھے اور ہماری دھاڑ سے کائنات رعشہ براندام ہو جاتی تھی۔ یہ وہی وقت تھا، جب ہم صحیح معنوں میں اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے۔ جب ہم پر الٰہی انعامات کی بارشیں پیہم برستی تھیں۔ جب ہمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جنت دی جاتی تھی۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ.

اللہ نے مومنوں سے جان و مال کی قربانی لے کر جنت دے دی۔

جب ہم سے مغفرت و اجرِ کریم کے وعدے ہوتے تھے

وعد اللہ الذین امنو مغفرۃ واجر کریما.

اللہ نے مسلمانوں سے مغفرت و اجرِ کریم کا وعدہ کر لیا ہے۔

اور جب ہم کو استخلاف فی الارض و تمکّن فی الدین کی بشارتیں دی جاتی تھیں۔

وعد الله الذين امنوا و عملو الصّلحٰت منكم ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا.

اللہ مسلمانوں سے تین وعدے کرتا ہے۔اول۔انھیں دنیا میں سلطنت دی جائے گی، دوم: الٰہی دین کی جڑیں استوار ہو جائیں گی اور سوم یہ کہ انھیں اس قدر طاقت ور بنا دیا جائے گا کہ دوسری قومیں ان سے ڈریں گی اور یہ کسی سے نہیں ڈریں گے۔

ہم اسی وقت واقعی اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے، لیکن آج اس پستی و ذلت، اس سیاسی و اخلاقی مسکنت، اسی دینی و دنیوی دیوالیہ پن کے بعد خدا کے محبوب ہونے کا دعوٰی کرنا پرلے درجے کی حماقت و جہالت ہے، جن مسلمانوں کو کوئی پاس نہیں بیٹھنے دیتا، جن سے جہان بھر نفرت کرتا ہے۔جن کے جسموں سے بدبو آتی ہے۔ جن کے کپڑوں میں لاتعداد جوئیں پھرتی ہیں، جو بازاروں، محفلوں اور عدالتوں میں نہایت دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں، جن سے ملک کے جیل خانے پٹے پڑے ہیں، جن کی جہالت و لاعلمی سے زمین و آسمان نالاں ہیں، جو غلام اور رسوا اور ذلیل ہیں، جن کے تاجر بددیانت ہیں، جن کے پیشہ ور فریب کار و مکار ہیں، جن کے علماء و صوفیاء دین و ایمان کے راہ زن ہیں، جن میں دین و دنیا کی کوئی خوبی نہیں۔کیا خدا ایسی ننگِ انسانیت قوم کو اپنا لاڈلا بناتا پھرتا ہے؟ کیا خدا کو (خاکم بہ دہن) آپ نے اتنا بدمذاق سمجھ رکھا ہے کہ اپنی محبت کے لیے رسواترین و قبیح مخلوق کو انتخاب کرے گا؟ جس اللہ کے حسنِ مذاق اور لطفِ طبیعت پر یہ حسین کائنات، یہ جمیل مناظر، یہ درخشاں

اجرامِ سماوی اور لعل و گہر وشاہد ہیں۔ جس کی تعریف میں کہا جاتا ہے۔

ان الله جميل " ويحب الجمال

اللہ خود حسین ہے اور صرف حسن کو پسند کرتا ہے۔

کیا ایسے جمیل المذاق خُدا کو اِن رسوائے عالم مسلمانوں کے بغیر کوئی اور مخلوق محبت کے لیے نہیں ملتی؟

• ہوش میں آؤ اور دیکھو کہ ہندوستان تم سے چھن گیا، سپین کی سلطنت کے ساتھ تم بھی جلاوطن ہوئے، مراکش، طرابلس، سوڈان اور مصر تمہارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ بصرہ، بغداد، حلب و دمشق، موصل و یروشلم، البانیہ، بلگیریہ، آسٹریا، رومانیہ اور ہنگری سے۔۔۔۔تمہاری فرماں روائی کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ سسلی اور فرانس، ترکستان اور بخارا غرضیکہ دیکھتے دیکھتے ایک عالم کی سلطنت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور حالت یہ ہے کہ ہماری رہی سہی متاع پر راہ زنوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

علمی لحاظ سے ہم کسی وقت استاذِ زمانہ تھے، مشرق و مغرب ہمارے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے تھے اور آج ہم اجہل الناس ہیں۔

اقتصادی طور پر آج یہ کیفیت ہے کہ کھانے کو ایک پیسہ تک جیب میں نہیں۔ صرف پنجاب کے مسلمانوں پر ۱۴۰۰۰۰۰۰۰۰ روپیہ سودی قرض ہے۔ اخلاق کا یہ عالم ہے کہ ہر مسلم کو (باستثنائے چند) دھوکے باز، مفسد اور جھوٹا خیال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کی دکان سے کوئی سودا نہیں لیتا کہ ضرور دھوکا دے گا۔

جب مسلم کے تمدن، سیاست، علم اور اخلاق کا یہ عالم ہے، تو پھر تباہی اور کس جانور کا نام ہے؟ کیا آپ کو ابھی تک اپنی تباہی و بربادی کا احساس نہیں ہوا؟ تباہی کی

انتہا یہ ہے کہ تباہ شدہ قوم میں تباہی کا احساس تک باقی نہ رہے:

چوں شود اندیشۂ قومے خراب
ناسرہ گردد بہ دستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم
در نگاہِ او کج آید مستقیم!
بر کراں از حرب وضربِ کائنات
چشمِ او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند
گوہرِ او چوں خزف ناارجمند
پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

(اقبالؒ)

[مطبوعہ: البیان ____ امرتسر؛ شمارہ جولائی ۱۹۴۰ء]

☆☆☆

چاند کے مہینے اور ان کے نام

جب دنیا کے مختلف ممالک میں عربوں نے حکومتیں قایم کیں۔ تو وہاں سنہ ہجری کو رواج دیا۔ عرب مصنفین نے تمام کتابوں میں ہجری تاریخیں درج کیں۔ جب اہلِ عرب کے علوم وفنون دنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے تو رفتہ رفتہ سنہ ہجری کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔

آمدِ اسلام سے بہت پہلے قمری مہینوں کے نام یہ تھے:

موتمر، ناجر، صوان، زبا، بایِد، اصم، داغل، باطل، عادل

نوٹ: باقی دو مہینوں کے نام نہیں مل سکے

ان کے ہاں سال ۳۵۴ دن کا ہوتا تھا، یعنی سال شمسی سے گیارہ دن کم اس کمی کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک ہی مہینہ کبھی جاڑے میں پڑتا تھا اور کبھی گرمی میں اس دقّت کو رفع کرنے کے لیے ہر تیسرے سال لوند (لیپ) کا ایک مہینہ بڑھایا جانے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد حالاتِ موسم و دیگر ملکی وتمدنی وجوہات کی بنا پر مہینوں کے نام بدل دیے گئے ہیں۔ جو یہ ہیں

محرم، صفر، ربیع الاوّل، ربیع الثّانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ، رجب، شعبان، رمضان، شوّال، ذو القعدہ، ذو الحجہ،

(۱) محرم: کے معنی ہیں ”حرام“ چونکہ کسی مذہبی نقطۂ نظر سے وہ لوگ اس مہینے میں لڑائی کو حرام سمجھتے تھے، اس لیے اس کا نام محرّم رکھا گیا۔

(۲) صفر: مشتق ہے صِفر سے جس کے معنی ہیں خالی ہونا" چونکہ محرم گزرنے کے بعد اس ماہ میں لڑائی کے لیے قصبوں کو خالی کر دیا جاتا تھا، اس لیے اس کا نام صَفر ہوا۔

(۳) ربیع الاوّل: ربیع کے معنی بہار اور اول کے معنی پہلا ہیں۔ یہ ماہ موسم بہار کا پہلا مہینہ تھا۔

(۴) ربیع الآخر: اور یہ مہینہ بہار کا دوسرا مہینہ تھا۔

(۵) جمادی الاولیٰ: جمادی کا مادہ جماد ہے، جس کے معنی ہیں بند ہونا، جم جانا، وغیرہ۔ چونکہ اس ماہ میں بارش بند ہو جاتی تھی۔ اس لیے یہ نام تجویز ہوا۔

(۶) جمادی الثانیہ: الثانیہ، دوسرا۔ خشک موسم کا یہ دوسرا مہینہ تھا۔

(۷) رجب: رجب۔ تعظیم کرنا۔ بعض مذہبی وجوہات کی بنا پر یہ مہینہ بھی مقدس سمجھا جاتا تھا۔

(۸) شعبان: شعب سے مشتق ہے۔ شعب، بکھر جانا۔ اس ماہ میں پانی کی تلاش شروع ہوتی تھی۔ اور قبایل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔

(۹) رمضان: مشتق ہے رمض سے رمض، سخت گرمی، یہ مہینہ بہت تپتا تھا۔

(۱۰) شوال: مشتق ہے شول سے۔ شول۔ اونٹنی کے دودھ کا خشک ہو جانا۔ شدت حرارت، گرمی ہوا اور کمی باراں کی وجہ سے اس ماہ میں اونٹنیوں کے دودھ سوکھ جاتے تھے۔

(۱۱) ذوالقعدہ: قعدہ، بیٹھنا، ذو۔ والا۔ یہ مہینہ بھی مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ لڑائیاں بند کر کے گھروں میں بیٹھ جاتے تھے۔

(۱۲) ذوالحجہ: حج۔ یہ حج کا مہینہ تھا۔

خاندانِ اُمیّہ کے پانچ عبدالرّحمٰن

عبدالرّحمٰن اوّل:

(۷۸۶تا۷۸۸ء) ہسپانیہ میں اسلامی حکومت کا بانی تھا۔ جب خاندانِ امیہ کو زوال آیا، تو اس کی عمر بیس سال تھی۔ وہ اپنے بھائی یحیٰےٰ کے ہمراہ قبائل عرب میں پناہ جو ہوا۔ لیکن عباسی پولیس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ ایک مقام پر دونوں بھائی نرغے میں آ گئے۔ یحیٰےٰ قتل ہو گیا اور عبدالرحمٰن نے پہلے شام میں پھر شمالی افریقہ میں پناہ لی۔ وہاں بھی چین حاصل نہ ہوا۔ تو بھاگ کر ماری ٹانیا (Mauritania) کے بربری قبائل کے ہاں سر چھپایا۔

اس کے ماموں مسلمہ نے پیش گوئی کی تھی عبدالرحمٰن امیہ کی عظمتِ گم گشتہ کو واپس لائے گا۔ اس تمام دوڑ بھاگ میں عبدالرحمٰن اس پیش گوئی کے ظہور کا منتظر رہا۔

اس وقت ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کافی پریشان حالت میں تھی۔ ایک طرف عربوں کے قبائلی تنازعے پھر زندہ ہو چکے تھے۔ اور دوسری طرف بربروں اور عربوں کی نسلی منافرت تشدد کا باعث بن رہی تھی۔ یوسف امیر ہسپانیہ ہر طاقت ور پارٹی کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جاتا تھا۔

اس وقت قرطبہ میں امیہ خاندان کی ایک طاقت ور جماعت موجود تھی۔ جو کسی واقعہ کا انتظار کر رہی تھی۔ عبدالرحمٰن نے سپین کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس جماعت کو ایک خفیہ پیغام بھیجا اور حسبِ مرضی جواب آنے کے بعد ستمبر ۷۵۵ء کو ملاغہ کے مشرق میں المیونقر (Almunicar) کے مقام پر اترا اور قرطبہ پہنچ کر سازشوں کا

جال پھیلانا شروع کر دیا۔

جب یوسف امیرِ ہسپانیہ کو ان واقعات کا علم ہوا۔ تو اس نے بجائے سختی کے نرمی اختیار کی اور عبدالرحمٰن کی کچھ زمین کے علاوہ اپنی بیٹی بھی اس کے نکاح میں دینا چاہی۔ ابھی ان مراعات پر غور ہو رہا تھا کہ یوسف کے قاصد نے ایک اموی سردار عبید اللہ کو یہ کہہ کر طیش دلایا کہ ''تو عربی نہیں جانتا،'' عبید اللہ نے فوراً تلوار سونت لی۔ تمام قوم اس کی صدا پر جمع ہو گئی اور ۱۶ مئی ۷۵۶ء کو قرطبہ کے پاس یوسف کو شکست ہوئی۔ عبدالرحمٰن اس فوج کی کمان کر رہا تھا۔ تمام فوج میں صرف ایک گھوڑا تھا کہ جس پر خود عبدالرحمٰن سوار تھا۔ اور ایک سبز پگڑی کو نیزے کے ساتھ لپیٹ کر قومی جھنڈا تیار کیا گیا تھا۔ یہ جھنڈا یعنی پگڑی اور نیزہ، بعد میں ہسپانوی، اسلامی حکومت کا مستقل جھنڈا قرار پایا۔

۷۶۳ء میں خلیفۂ بغداد کے بعض حمایتیوں نے چند شورش پسند افراد جمع کر کے عبدالرحمٰن کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ قرطبہ کے پاس جنگ ہوئی۔ جو باغیوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ عبدالرحمٰن نے چند باغی سرداروں کے سر کاٹ کر ان میں نمک اور کافور بھر کر بہ طورِ ہدیہ خلیفہ بغداد کے ہاں بھیج دیے۔

آخر میں شاہی محل کی مسلسل سازشوں نے عبدالرحمٰن کو ترش مزاج اور تند خو بنا دیا ورنہ آغاز میں وہ بڑا حلیم الطبع اور خوش خلق تھا۔

اس کا نام بانیان حکومت کی فہرست میں سنہری حروف سے لکھا گیا۔ اس لیے کہ اس نے سلطنت کی بنیاد تدبر و حکمت کی ایسی مستحکم چٹانوں پر رکھی کہ ۲۰۰ سال تک حوادث کی بڑی سے بڑی موج اسے جنبش نہ دے سکی۔

عبدالرحمٰن ثانی:

(۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) اس کی حکومت کا کوئی شان دار کارنامہ اوراقِ تاریخ میں محفوظ نہیں۔ مؤرخ اسے ایک کم زور بادشاہ سمجھتا ہے کہ جس کا عہد سلطنت اندرونی بد نظمیوں کی وجہ سے بدنام تھا۔ وہ امیہ خاندان کے ہسپانوی حکم رانوں میں سے تھا۔

عبدالرحمٰن ثالث:

(۹۱۲ء تا ۹۶۱ء عبدالرحمٰن ثالث تختِ ہسپانیہ پر ۲۲ برس کی عمر میں بیٹھا اور پچاس سال تک نہایت دھڑلے سے حکومت کی۔ اس کے والد کا نام محمد اور دادا کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ایک بہت کمزور اور ناقص فرماں روا تھا۔ اسے اپنے لڑکے محمد پر کئی قسم کے سیاسی شبہات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ اپنے دوسرے لڑکے مطرف کو اشارہ کیا اور اس نے موقعہ پا کر محمد کو مار ڈالا۔ عبداللہ کی وفات کے بعد عبدالرحمٰن ثالث سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس وقت تمام ملک بدامنی و خانہ جنگی کا محشرستان بنا ہوا تھا۔ ہسپانیہ کے اصلی باشندے ایک ایسے طاقت ور حکم ران کے آرزومند تھے۔ جو ملک میں امن قائم کر کے اہل ملک کو فارغ البالی وخوش حالی کی راہ پر ڈال سکے۔ چوں کہ عبدالرحمٰن کے متعلق عام خیال یہی تھا کہ وہ ایک بااصول، پرہیبت، اور امن پسند فرماں روا ثابت ہو گا۔ اس لیے اہلِ ملک نے اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور تمام ملک میں ایک منظم حکومت قائم ہو گئی۔

اس وقت مصر اور شمالی افریقہ کے فاطمیوں میں ایک عالم گیر خلافت قائم کرنے کا سودا سمایا اور ان لوگوں نے اپنے پہلے حملے کے لیے سپین کو انتخاب کیا۔ لیکن قبل اس

کے کہ فاطمیوں کا یہ ارادہ پورا ہو، عبدالرحمٰن نے خود مصر میں اعدائے فاطمیہ کی مدد کرنا شروع کر دی اور اس طرح فاطمیوں کا یہ ارادہ شرمندۂ عمل نہ ہو سکا۔

کچھ عرصے کے بعد خود عبدالرحمٰن کو خلیفہ بننے کا خیال آیا۔ چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۹۲۹ء کو اس دعوے کا اعلان کر دیا۔ بعض مسلم امراء نے اس دعوے کو برا مانا اور سازشیں شروع ہو گئیں۔ پورے دس سال کے بعد عیسائیوں کی ایک جماعت نے بغاوت کر دی اور الہنڈیگا (Alhandiga) کے مقام پر عبدالرحمٰن کو شکست ہوئی۔

مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ ہسپانیہ کو اس عہد میں اس قدر آرام، خوش حالی اور فارغ البالی حاصل تھی کہ جس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ حالات اور زیادہ قابلِ رشک ہوتے، اگر عبدالرحمٰن کو سازشی امراء کی ریشہ دوانیوں سے ایک دن بھی نجات حاصل ہوتی۔ ایک انگریز کیا پتے کی بات کہتا ہے۔

Abdur Rehman III adminstered well not by means of but inspite of Mahammedans. عبدالرحمٰن نے مسلمانوں کی مدد سے نہیں، بلکہ ان کے باوجود نہایت شان سے حکومت کی۔

عبدالرحمٰن مالیے کا ایک حصہ انتظام ملک پر، ایک حصہ عمارات پر صرف کرتا اور ایک حصہ جمع کرتا۔ اس نے قرطبہ کے تین میل جنوب میں ایک عظیم الشان عمارت بنام زھرا تیار کرائی تھی جس پر دس ہزار کاری گر و مزدور ۲۵ سال تک کام کرتے رہے۔ لیکن اب اس عمارت کے کھنڈر تک باقی نہیں رہے۔

ایک انگریز مؤرخ کہتا ہے کہ عبدالرحمٰن کے حرم سرا میں چھ ہزار عورتیں تھیں۔

عبدالرحمٰن رابع:

عبدالرحمٰن رابع ۱۰۱۷ء میں تختِ ہسپانیہ پر متمکن ہوااوراسی سال ایک جنگ میں جب وہ اپنی فوج کی بغاوت سے جان چھپا کر بھاگ رہا تھا، شہید ہو گیا۔

عبدالرحمٰن خامس:

(۱۰۲۳ء تا ۱۰۲۴ء) عبدالرحمٰن خامس ۱۰۲۳ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۱۰۲۴ء بے کاروں کے ایک گروہ نے جس کی کمان اس کا ایک عم زاد کر رہا تھا اس پر حملہ کر دیا اور وہ جان بر نہ ہو سکا۔

[مطبوعہ: البیان ___ امرتسر؛ ستمبر ۱۹۴۰ء]

☆☆☆

عید

کیا آج عید ہے؟ بازاروں کی چہل پہل، جوڑوں کی بھڑک، چہروں کی غیر معمولی بشاشت اس کا جواب اثبات میں دیتی ہے لیکن میرا دل اس حقیقت سے منکر ہے۔

آہ! ہماری عید کو گزرے ہوئے صدیاں ہو چکیں۔ ہماری مسرتیں افسردگیوں میں، ہماری تمنائیں مایوسیوں میں اور ہماری عشرتیں رنج والم کی پائیدار ساعتوں میں تبدیل ہو گئیں۔

فطرت کے تماشازار میں بہاریں آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ آسمان کی نیلی فضاؤں میں گھٹائیں بن بن کر برسیں گی اور کھل جائیں گی دُنیا ہزاروں کروٹیں لے گی اور لے لے کر تھمے گی۔ سطحِ ہستی پر سینکڑوں نقوش اُبھریں گے اور اُبھر اُبھر کر مٹیں گے۔ سب کُچھ ہوگا لیکن اگر نہیں ہوگا تو ہمارے ہلالِ عید کا دوبارہ طلوع۔

مجھے ایک بھولی ہوئی عید کی یاد ستاتی ہے:

تیرہ سو سال پہلے حجاز کی سرحدوں پر جانبازانِ اسلام کا ایک لشکرِ جرار ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ ماہِ رمضان کی اُنتیسویں تاریخ ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد ہزار ہا بے تاب نگاہیں اُفقِ مغرب پر بلند ہوئی ہیں اور شفق کی ارغوانی فضا کو چیرتی ہوئی مہِ نو تک جا پہنچی ہیں۔ پھر کیا ہے؛ وہ علم بردارانِ توحید، وہ سرشارانِ محبت وہ صداقت کے پُتلے، شجاعت کے مجسمے وطن کی محبت میں ڈوبے ہوئے، شہرِ رسول ﷺ کو پاپیادہ اس طرح

روانہ ہوتے ہیں کہ ہزار ہا سجود اُن کی جبین میں اور لکھوکھ ہا صداقتیں اُن کے سینوں میں تڑپ رہی ہیں۔ صبح ہوتی ہے؛ مدینہ طیبہ میں ایک ہیجان ہے۔ ہر فرد مسجد میں جانے کے لیے بے تاب ہے۔ کُچھ دیر میں شیدایانِ اسلام کا ایک جم غفیر مسجدِ نبوی میں جمع ہو جاتا ہے۔ مدینہ کی فضا تکبیر کی مقدس آوازوں سے لبریز ہے اور ہوا عطر ائیوں سے معمور۔ آخر وہ وقت آ جاتا ہے کہ اسلام کا وہ مایہ ناز ساربان یعنی فاروقِ اعظم جس کی شوکت سے قیصر و کسریٰ کے سر بفلک محل لرز گئے، جس کی آبدار تلوار نے کفر و شرک کے اندھیروں کو پاش پاش کر دیا؛ سرِ منبر نمودار ہوتا ہے۔ آنکھیں لذتِ خشوع سے لبریز، دل نیاز سے معمور۔ سر جھکا ہوا اور چہرے پر یادِ ماضی کے گہرے اثرات۔

آپ چند منٹ خاموش رہتے ہیں اور دُنیا بے تابی سے آپ کے ارشادات کی منتظر۔ آخر مہرِ سکوت ٹوٹتی ہے اور آپ یوں فرماتے ہیں:

حضرات! ہمارے آقا بہ ظاہر ہم سے رُخصت ہو گئے لیکن حقیقت یوں نہیں۔ وہ سامنے سبز گنبد کی خلوتوں میں آرام فرما رہے ہیں اور ہمارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے ارشاداتِ مقدسہ آپ کی دی ہوئی الہامی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ گو آپ کو ہماری آنکھوں سے پنہاں ہوئے پورے دس سال گزر چکے ہیں لیکن ہمارے شغف، ہمارے شوقِ عمل، ہماری بے تابیوں میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ ہم آپ کا مقدس پیغام لے کر اُٹھے اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا۔ کفر و شرک کی ظلمتیں چھٹ گئیں، باطل کی دیواریں متزلزل ہو گئیں، قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں سے پامال ہو رہی ہیں یزدجرد و نجاشی کے سر جھک گئے۔

خداوندِ قدوس ہم سے وعدہ کر چکا ہے کہ اگر ہم نے منزلِ حیات کا رہبر،

اس کتابِ مقدس کو بنایا تو اس کی رحمتیں ہمارے جلو میں، اقبال ونصرت ہمارے ہم رکاب اور شکوہ وجلال ہمارے ہم دم رہیں گے۔

خداوندِ برتر کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمارے دامن ابھی تک دُنیائے فانی کی آلائشوں سے داغ دار نہیں ہوئے۔ ایران کے عدیم المثال لالہ زار، روم کا فقید النظیر حُسن و جمال، مصر کی شُہرہ آفاق سرسبزیاں ہمارے قبضے میں ہیں لیکن ہمارے جانبازوں کے دل الفتِ رسول ﷺ میں اس حد تک ڈوبے ہوئے ہیں کہ وہ ان تمام نعمتوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور جستجوئے صداقت میں یوں دیوانے ہیں کہ اُنھیں کوئی چیز فرزانہ نہیں بنا سکتی۔

اے کاش! آج ہمارے آقا موجود ہوتے اور اپنے دیوانوں کا نظارہ فرماتے۔ فاروقِ اعظم کی زبان پر یہ فقرہ تھا کہ یادِ رسولؐ سے آنکھیں نم ہوگئیں۔ آپ کی زبان ہیجانِ جذبات سے رُک گئی؛ دفعتاً آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آپ کی ریشِ مبارک آنسوؤں سے بھیگ گئی، مسجد میں ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے یادِ رسولؐ میں رو رو کر نماز ادا کی۔ عید گزر گئی وہ سماں بکھر گیا لیکن شہرِ رسولؐ کے رہنے والے مہینوں فاروقِ اعظمؓ کے الفاظ کو یاد کر کے رویا کیے۔

حضرات! کیا آج بھی ویسی ہی عید ہے۔ نہیں نہیں۔ مجھے اپنا پہلا فقرہ دُہرانا پڑے گا کہ ہماری عید کو گزرے صدیاں ہوگئیں۔ بھلا یہ تو فرمایئے۔ عید منائے تو کون؟ کیا تُرکی عید منائے جو بزمِ گیتی میں چراغِ سحر کی طرح آخری دم توڑ رہا ہے۔ کیا مصر و عراق عید منائیں جن کی آزادی پر مزید ۲۵ سال کے لیے پہرے بٹھا دیے گئے۔ کیا ایران عید منائے جسے اغیار کی ریشہ دوانیوں سے دم بھر چین نصیب نہیں۔ کیا ہندوستان

عید منائے جس کی شمعِ حیات خاندانِ مغلیہ کے ساتھ ہی گُل ہوگئی۔ کیا افغانستان عید منائے؟ آہ افغانستان!!!

دل میں اِک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کہتے کہتے مجھے کیا جانیے کیا یاد آیا

عید کا دن ہے ایک گدا تک وطن پہنچ کر اعزہ و احباب سے گلے مل رہا ہے۔ اے افغانستان کیا یہ راحت تیرے بادشاہوں کی قسمت میں بھی نہیں۔ آہ! خاکِ کابل تو اپنے معزز مکینوں کے فراق میں رو رہی ہو گی۔ تیری گود سے تیرے کتنے پیارے بچے الگ ہو گئے اور عید کے دن بھی تُجھ سے گلے نہ مل سکے۔ اس سے زیادہ کہنے کی طاقت نہیں۔

حضرات! مجھے سہ بارہ یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہماری عید کو گزرے صدیاں ہو چکیں اور وہ واپس آنے کی نہیں!!!

[غیر مطبوعہ ________ ۱۹۲۸ء]

☆☆☆

رامائن اور رامچند ر جی

رامائن:

یہ سنسکرت کی ایک مشہور نظم ہے۔ کہ جس میں عہد قدیم کے مشہور شاعر بالمیک جی نے مہاراجہ رام چندر جی کے مفصل سوانح حیات قلمبند کیے ہیں۔ یہ کتاب کافی دفعہ طبع ہوئی۔ اوراس کے قلمی نسخے بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ ان نسخوں میں اشلوکوں کا کافی اختلاف ہے۔ لیکن اصل کہانی کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔

کئی رامائن:

بالمیک کے علاوہ کئی اور بزرگوں نے بھی رامچند ر جی کے سوانح حیات لکھے۔ چنانچہ اس وقت کئی رامائنیں دنیا میں ملتی ہیں۔ جن میں سے مشہور یہ ہیں آدی رامائن ۔ مول رامائن۔ ہنومان ناٹک ۔ تلسی رامائن ۔ اوبھت رامائن ۔ یوگ وششٹ رامائن۔ ان سب رامائنوں کا ماخذ بالمیکی رامائن ہے۔ سب سے پہلی رامائن بالمیکی رامائن ہے۔ اور آخری تلسی رامائن ہے۔ کہ جو اکبر بادشاہ کے زمانے میں تصنیف کی گئی تھی۔

اوبھت رامائن کہ جس میں بہت سے عجیب وغریب باتیں شامل کردی گئی ہیں۔ شنکراچاریہ کے ایک چیلے کی لکھی ہوئی ہے۔ مشہور مغل شہزادے داراشکوہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

رامائن میں اضافہ:

بالمیکی رامائن کے دیباچے میں درج ہے کہ اس کے چھ کانڈ (باب) ہیں لیکن موجودہ رامائن میں سات کانڈ ملتے ہیں۔ پروفیسر گریفتھ بابو ہریش چندر بناری اور پنڈت

لیکھرام (آریہ مسافر کے ایڈیٹر) کا خیال یہ ہے۔ کہ ساتواں کانڈ بعد کا اضافہ ہے۔

حجمِ رامائن:

موجودہ رامائن میں ۱۹۷۸۲ اشلوک پائے جاتے ہیں۔ اور اگر اتر کانڈ کے اشلوکوں کو، کہ جو بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ نکال دیا جائے۔ تو پھر ۱۸۰۰۰ اشلوک باقی رہ جاتے ہیں۔

رامائن کب لکھی گئی:

یہ معلوم کرنا کہ رامائن کب لکھی گئی تھی۔ بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ رامائن میں تاریخ تصنیف کا ذکر موجود نہیں۔ اور نہ ہی بعد کا کوئی مؤرخ یا مصنف اس کی تاریخ دریافت کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ بعض انگریز مصنّفین کا خیال یہ ہے۔ کہ رامائن مہابھارت کے بعد لکھی گئی۔ یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ مہابھارت میں رامائن کا مختصر سا خلاصہ دیا ہوا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مہابھارت سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔

پادری بٹلی صاحب کہتے ہیں کہ رامائن کا زمانہ صرف ۹۵۰ برس قبل از مسیح ہے کرنیل ٹاڈ فرماتے ہیں کہ رامچند رجی مسیح سے ۱۱۰۰ سال پہلے گذرے۔ مسٹر گروس۔ کہ جس نے رامائن کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ کا خیال یہ ہے کہ رامچند رجی اور رامائن کا زمانہ ۱۳۰۰ قبل مسیح ہے سر ولیم جونس کہتے ہیں۔ کہ رامائن مسیح سے ۲۰۲۹ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ الغرض محققین کسی تسلی بخش نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔

دوسری طرف ہندوستان کے بڑے بڑے جوتشیوں کا خیال یہ ہے کہ مہابھارت

کی جنگ آج سے ۵۰۴۱ سال پہلے ہوئی تھی۔ اس سے پہلے دواپر کا زمانہ تھا۔ کہ جو ۸۸۴۰۰۰ سال لمبا تھا۔ اور اس سے پہلے تریتا یگ تھا۔ کہ جو ۱۲۹۶،۰۰۰ سال لمبا تھا۔ ان جوتشیوں کے قول کے مطابق رامچند ر جی اس وقت پیدا ہوئے تھے۔ کہ جب تریتا یگ جا رہا تھا۔ اور دواپر شروع ہو رہا تھا۔ اور چونکہ بالمیک جی رامچند ر جی کے ہم عصر تھے۔ اس لحاظ سے رامائن آج سے ۸۸۹۰۴۱ سال پہلے کی تصنیف بنتی ہے۔

کیا اس زمانے میں انسان موجود تھے؟:

یہاں قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج سے نو لاکھ سال پہلے انسان موجود تھے۔ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ انسان کی پیدائش بہت پرانے زمانے کا واقعہ ہے۔ چنانچہ SECRET DOCTRINE, کے مصنف اسی کتاب کی جلد دوم مطبوعہ لنڈن ۲۳۲ھ میں فرماتے ہیں۔ کہ مصر کا پہلا مینار آج سے ۸۰۰۷ سال پہلے تیار ہوا تھا۔ یونان کا مشہور حکیم افلاطون جو مسیح سے ۴۲۷ پہلے گذرا تھا۔ اپنے زمانہ میں باشندگانِ مصر کے متعلق کہتا ہے۔

''مصر میں ۱۰،۰۰۰ سال پہلے سنگتراشی و مصوری حدِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔''

منیتھان نامی ایک مصری مورخ کہتا ہے کہ مصر کے ایک خاندان نے ۲۰ ہزار سال تک مصر پر حکومت کی۔ (تاریخ مصر ۲ے سے ۵ے تک)

علم جیالوجی کے پروفیسر مسٹر ڈریپر فرماتے ہیں کہ سکاٹ لینڈ کے ایک علاقے میں انسانوں کی ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں کہ جو ۲۴۰،۰۰۰ سال پہلے کی معلوم ہوتی ہیں (رسالہ تھیوسافسٹ اکتوبر ۱۸۷۹ء ص ۹ کالم ۱) ایک اور صاحب حیوانی زندگی کی

ابتداء آج سے ۳۰،۰۰،۰۰۰ پہلے بتلاتے ہیں۔ ان نظریوں کو دیکھتے ہوئے، یہ بالکل ممکن ہے کہ رامائن آج سے ۹ لاکھ سال پہلے لکھی گئی ہو۔ لیکن اس تاریخ کا کوئی قطعی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں۔

رام چندر کی ولادت:

رامائن بال کانڈ سرگ ۱۸۔ اشلوک ۷۔۱۲ رامچندر جی کی تاریخ پیدائش یوں درج ہے۔
"کہ آپ چیت کے مہینے میں نویں تاریخ چاند کی چودھویں رات کو کہ جب مشتری اور چاند کا ملاپ ہو رہا تھا۔ پیدا ہوئے۔
سن کون سا تھا۔ اس کا ذکر نہیں۔

رام چندر جی کی حیثیت:

قدرت کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ دنیا میں سیاہ کاری پھیل جانے کے بعد خدائی رحمت ہمیشہ کسی انسانی صورت میں اہل دنیا کو بچانے کے لیے آیا کرتی ہے۔ آج سے بہت پہلے جب زمانے میں عیش پرستی بڑھ گئی۔ ظلم کا دور دورہ ہو گیا۔ نیکی پر بدی نے غلبہ پا لیا۔ ہر طرف سے مظلوموں کی فریادیں بلند ہونے لگیں۔ امن پسند اور نیک لوگ شہروں سے بھاگ کر جنگلوں میں پناہ لینے لگے۔ سچائی کا سورج گناہوں کی گھٹاؤں میں گھر گیا۔ اور رُوح کی دنیا پیاس سے بے تاب ہو گئی۔ تو اس خدا نے۔ کہ جو پیاسی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لیے بادلوں کی سہانی دنیا تعمیر کیا کرتا ہے۔ اپنی رحمت راما کے روپ میں بھیجی۔ راما نے گناہ سے جنگ کی۔ باطل کو بیخ دبن سے اکھاڑ پھینکا۔ اور اپنے بلند اخلاق۔ فرمانبرداری۔ وفاداری۔۔ شفقت۔ رحمدلی۔ نیکی اور

پاکیزگی کی وہ مثال قائم کر گیا۔ کہ آج آٹھ لاکھ سال گزرنے کے بعد بھی دنیا کے لیے ستونِ نور کا کام دے رہی ہے۔

راما کیا تھا؟:

راما ایک نہایت فرمانبردار بیٹا تھا۔ سوتیلی ماں کے کہنے پر آپ کا والد دسرت آپ کو نہ صرف تاج وتخت سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ بلکہ چودہ سال کے لیے بن باس کی بھی سزا دیتا ہے۔ راما اس فیصلے کو مسکراتے ہوئے سنتا ہے۔ گھر کی شاہانہ زندگی۔ محلات۔ نوکر۔ لونڈیاں۔ کشلیاں کی محبت باپ کے آنسو اور رعایا کا اصرار۔ الغرض کوئی چیز اسے والد کی تابعداری سے نہیں روک سکتی۔ وہ دنیا کا بہت بلند انسان شاہی کپڑے اتار۔ جوگیانہ لباس پہن۔ بغیر ایک آنسو بہائے دارالخلافہ اجدھیا سے یوں نکل جاتا ہے۔ کہ جس طرح بوئے گل چمن سے نکل جاتی ہے۔ جنگل میں سخت سردی ہے۔ دریائے گنگا کا کنارہ ہے۔ وہ مسافر شاہزادے گھاس کا بستر تیار کرتے ہیں۔ اور آگ جلا کر ارد گرد سر جھکائے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ چلتے وقت باپ کے گرتے ہوئے آنسو۔ والدہ کی فریادیں۔ وہ عورتوں کا چھتوں پر چڑھ کر دیر تک انھیں دیکھتے رہنا۔ یہ تمام مناظر راما کی نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی نیچر غالب آجاتی ہے۔ اور راما ٹھنڈی آہ لے کر کہتا ہے۔

''پیارے لکشمن! یہ چودہ سال کب گزریں گے۔ ماتا جی کو کون دلاسا دے گا۔ پتا جی کو کیسے قرار آئے گا۔''

جس طرح پہاڑ پھٹ پڑتے ہیں، تو چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اسی طرح راما کی

آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے دو چشمے بہہ نکلے۔ لکشمن اپنے بھائی کو روتے دیکھ کر کہتا ہے۔ RAMA, DO NOT CRY ONLY WEAK MINDS FIND CONFORT IN TEARS, کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھرت کے دل میں راما کو اجدھیا میں واپس لانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ جنگل تک ایک سڑک بنواتا ہے۔ جنگل میں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ دور گھنے درختوں کی بلند شاخوں سے دھواں لپٹ رہا ہے۔ وحشی جانور ہر طرف کھیل رہے ہیں۔ غریب راما۔ مسافر لکشمن اور بیکس سیتا اپنے چھونپڑے کے پاس آزاد ہرنوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ آہ یہ منظر دیکھ کر بھرت کا دل بھر آتا ہے۔ وہ روتے ہوئے آگے بڑھ کر راما سے لپٹ جاتا ہے۔ جب کشلیاں کی نظر الٹی سیدھی روٹیوں پر پڑتی ہے جوان مسافر شہزادوں نے تیار کی تھیں۔ تو ماتما کی ماری رو رو کر نڈھال ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بھرت اجدھیا کا تخت راما کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن راما جواب میں کہتے ہیں۔

''آؤ، ہم تم سلطنت بانٹ لیں۔ تم انسانوں پر حکومت کرو اور میں جنگلی جانوروں پر۔ تم سفید خیموں اور چھتریوں کے نیچے رہو اور میں درختوں کی سبز ٹہنیوں کے نیچے۔''

جب یہ بھائی جنگل میں ایک دفعہ اگسٹیا رشی کے پاس ٹھیرتے ہیں۔ تو وہ سیتا جی کے متعلق کہتا ہے کہ۔

''عورتیں خاوندوں پر صرف دولت کی حالت میں جان دیتی ہیں۔ اور تکلیف میں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ دانا عورتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ان کی وفاداریاں بجلی کی چمک سے زیادہ پائدار نہیں۔ ان کی محبت کا رخ موسمی ہواؤں کی طرح

بدلتا رہتا ہے۔ان کے پریم میں بِس بھرا ہوا ہے۔اور ان کے بوسے مرد کے لیے زہرِ قاتل ہیں۔لیکن سیتا ان تمام عیوب سے پاک ہے۔''

لنکا کا بادشاہ راون سیتا کے پاس پہنچتا ہے۔اپنی طاقت اور دولت کا رُعب جمانے کے بعد کہتا ہے۔

''میں لنکا کا بادشاہ ہوں۔اور دنیا کو سزا دینے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔میری ہیبت سے خدا و مخلوق ہر دو کانپتے ہیں۔اگر تم میری رانی بن کر میرے محل کی زینت بن جاؤ۔ تو میں سمندروں۔ پہاڑوں اور آسمانوں کی تمام دولت تمہارے قدموں میں لا ڈالوں گا۔تمام کائنات تمہاری پوجا کرے گی۔اور میں خود ایک غلام کی طرح تمہارے چرنوں میں حاضر رہونگا۔''

راما کی پجاری۔محبت کی ملکہ۔اور عصمت کی دیوی سیتا کیا غیر فانی الفاظ میں جواب دیتی ہے:۔

GO AWAY RAVAN, AS THE LOINESS FOLLOWS THE LOIN I SHALL FOLLOW RAMA

یہ نہیں کہا کہ جس طرح مرغی مرغ کے پیچھے یا کبوتری کبوتر کے پیچھے چلتی ہے بلکہ کہا تو یہ کہ جس طرح شیرنی شیر کے پیچھے چلتی ہے۔اسی طرح میں راما کے پیچھے چلوں گی۔

جب راون سیتا کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔اور راما ادھر اُدھر حیران پھرتے ہیں۔اور کھوج لگانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔تو ہنومان بندر حاضر ہو کر کچھ زیور پیش کرتا ہے۔ کہ جو سیتا نے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اس لیے گرا دیے تھے۔کہ کھوج نکالنے میں آسانی رہے۔رام چندر جی یہ زیور لکشمن کو دکھا کر پوچھتے ہیں۔''لکشمن۔کیا یہ زیور

واقعی سیتا کے ہیں۔'' تو لچھمن پاؤں کی انگلیوں اور ٹخنوں کے زیور الگ کر کے کہنے لگا۔ کہ یہ زیور تو یقیناً میری بھاوجہ کے ہیں۔ لیکن باقی کا علم نہیں۔ جب راما نے اس بے علمی کی وجہ پوچھی۔ تو لکشمن کہنے لگے۔ ''میں نے آج تک اپنی بھاوجہ کی صرف پاؤں ہی دیکھے ہیں۔ پاؤں سے اوپر کبھی نگاہ ڈالنے کی ہمّت نہیں کی۔

اللہ اللہ کیا زبردست کیرکٹر ہے۔ بلند اخلاقی کا کیا شاندار نمونہ ہے۔ شرم وحیا کی کیا لازوال مثال ہے۔

آج ہم مسلمانوں کو بعض مغرب زدہ نوجوان یہ طعنہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی بیویوں کو گھروں کی چار دیواریوں میں قید کر رکھا ہے۔ اور اگر وہ کسی وقت باہر نکلتی بھی ہیں تو پارسل کی طرح برقعوں میں لپٹی ہوئی۔ میں ان نوجوان دوستوں کو کہتا ہوں۔ کہ ہم اپنی سیتاؤں کو آج کھلے منہ باہر بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ تم لکشمن بن جاؤ اور تمہاری آنکھیں ان کے پاؤں سے اوپر کبھی نہ اٹھیں لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ آج لکشمن ناپید ہیں۔ اور ہماری گلیاں محلے اور بازار راونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ آپ ہی فرمائیے۔ کہ ہم اپنی سیتاؤں کو ان راونوں کے سامنے کس طرح بے پردہ بھیج دیں۔

شیطان:

تاریخ بتلاتی ہے۔ کہ شیطان ہر برگزیدہ اور نیک انسان پر ہمیشہ وار کرتا رہا۔ سب سے پہلا وار آدم وحوا پر کیا۔ اور انھیں جنت سے نکلوا کر باہر کیا۔ یوسف پیغمر کے سامنے شیطان زلیخا کا روپ بدل کر پہنچا۔ لیکن یوسفؑ اس آزمائش میں سے کامیاب ہو کر نکلا۔ موسیٰ کو شاہِ مصر کے محلات نصیب ہوئے۔ لیکن شاہی نعمتیں اور حسین لونڈیاں

اسے نیکی کی راہ سے نہ روک سکیں۔ پیغمبرِ اسلام کے سامنے تمام قریش کی دولت اور بے انداز اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اس شرط پر پیش کیے گئے۔ کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف بلانا چھوڑ دیں۔ لیکن آپ نے فرمایا۔

''اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دو۔ تب بھی میں اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں کی طرف پہنچانے سے باز نہیں رہوں گا۔''

بعینہٖ اسی طرح سیتا کو بد عہدی۔ غداری۔ اور بے وفائی کا سبق دینے کے لیے شیطان راون کے لباس میں نمودار ہوا۔ لیکن سیتا کے ایمان میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

لنکا فتح ہونے کے بعد رامچند رجی سیتا سے اس بنا پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ کہ جو عورت راون کے گھر میں اتنا عرصہ رہی ہو۔ وہ قابلِ اعتبار نہیں رہتی۔ سیتا اپنے بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے آگ کی چتا میں کود پڑتی ہے۔ چتا جل جاتی ہے لیکن سیتا کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ راما آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے دیوتاؤں میں ان کے والد دسرت بھی تشریف فرما ہیں۔ اگنی دیوتا کہتے ہیں۔

''راما! ساون کے بادلوں سے ٹپکی ہوئی بوندوں کی طرح تمہاری سیتا صاف۔ پاکیزہ۔ اور بے قصور ہے۔ اسے واپس لے کر اپنے دل کی سنگھاسن پر دوبارہ بٹھاؤ۔''

رامچند رجی کی طرح پیغمبر اسلام علیہ السلام کو بھی اپنی زوجۂ مطہرہ جنابہ عائشہؓ کے متعلق ایک دفعہ کچھ اس لیے شک پڑ گیا تھا۔ کہ آپ قافلہ سے پیچھے رہ گئی تھیں اور بعد میں ایک شخص مسمی صفوان بن المعطل کے ساتھ اونٹ پر سوار (۱) ہو کر آ رہی تھیں۔

---

(۱) اونٹ پر صرف جنابہ عائشہ صدیقہؓ سوار تھیں اور صفوان اونٹ کی مُہار تھامے ہوئے تھا۔

جناب پیغمبر صاحب کئی مہینے تک ناراض رہے۔ بعد میں عائشہؓ کی صفائی پر چند آیات

اتریں۔ اور وہ سیتا کی طرح دوبارہ اپنے سرتاج کے دل میں بسنے لگیں۔ حقیقتاً

پیغمروں کی اس طرزِ عمل میں بھی دنیا کے لیے ایک سبق پنہاں ہے۔ ہر مرد کو اپنی بیوی پر

کبھی نہ کبھی شبہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اللہ نے ہمارے سامنے حضرت رسول عربی ﷺ

اور حضرت رامچندر جی کے دو نمونے پیش کر کے ہمیں کسی فوری کارروائی کرنے سے

روک دیا ہے۔

کیا رام کی کہانی فرضی ہے؟:

بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ تمام کہانی فرضی ہے۔ اور عام ڈراموں کی طرح افرادِ

ڈرامہ یعنی راما، لکشمن، سیتا اور راون وغیرہ محض فرضی نام ہیں۔ ایک اور جماعت کا

خیال یہ ہے کہ رام چندر جی کے لنکا پر حملہ سے مراد قدیم ارین کی وہ حکومت ہے۔ کہ

جو جنوبی ہند میں قائم ہوئی تھی۔ اگر ہم بنٹلی، کرنل ٹاڈ اور مسٹر گروس کے بیانوں پر اعتماد

کرتے ہوئے رامچندر جی کا زمانہ صرف ۱۱۰۰ تا ۱۳۰۰ قبل از مسیح قرار دیں۔ تو یہ وہی

زمانہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ارین جنوبی ہند پر حکومت قائم کر رہے تھے۔ مسٹر سائکس

(SYKES HISTORY OF PERSIA) صفحہ ۱۰۱ پر لکھتے ہیں۔

''ارین نے بکٹریا پر ۲۵۰۰ ق م میں حملہ کیا۔ اور انکی ایک شاخ میڈس ایران میں

۲۰۰۰ ق م کو داخل ہوئی۔ یہی ارین فارس وخراسان سے ہوتے ہوئے ۱۵۰۰ ق م میں

کوہ ہندوکش سے گزر کر پنجاب میں داخل ہوئے۔''

ظاہر ہے کہ ان ارین کو جنوبی ہند تک پہنچتے پہنچتے دو سو سال اور صرف ہو گئے

ہوں گے۔ اس لیے انگریزوں کے ذکر کے مطابق رامچند رجی کا زمانہ وہی ہے کہ جب اریین جنوبی ہند میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن یہ محض خیالی نظریے ہیں کہ جن کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ راون سے مراد جنوبی ہند پر بدھوں کی حکومت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک (MYTHOLOGICAL) کہانی ہے۔ اور کہ رام سے مراد اندرا اور سیتا سے مراد زمین ہے۔ ایک اور گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کہانی کا لنکا والا حصہ یونانی شاعری (TROY LEGEND) سے لیا گیا ہے۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ کہانی بالکل حقیقی ہے۔ ورنہ ڈرامے تو ہزاروں لکھے جا چکے ہیں جن میں سے بعض بے حد دردناک بھی ہیں۔ تو کیوں باقی ڈراموں کے افراد کو اصلی نہیں سمجھا جاتا؟

ہندو بہت قدیم زمانے سے دسہرہ منا رہے ہیں۔ ہر سال رامچند رجی کی پوری کہانی ڈرامے کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اگر ہم رات دن کے چکّر کو الٹا گھما سکیں تو ہم یقیناً دسہرہ مناتے مناتے رامچند رجی کے چرنوں میں جا حاضر ہوں گے۔ لوگوں نے رامچند رجی کی فتح لنکا کی سالگرہ ٹھیک دوسرے سال منائی ہوگی۔ اور یہ سلسلہ مسلسل ہم تک پہنچ گیا۔ کروڑوں انسان لاکھوں سال تک غلطی نہیں کر سکتے۔ یہی حال محرم کا ہے۔ اگر آج سے دو لاکھ سال گزرنے کے بعد کوئی صاحب امام حسینؓ کے واقعہ کو فرضی ثابت کرنے لگ جائے یا کوفہ پر حسینؓ کی چڑھائی سے مراد محمود غزنوی کا داخلہ ہندوستان میں لیتا پھرے تو اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔

پیغمبروں پہ مصائب:

دنیا کے بڑے بڑے رہنماؤں کو اس لیے مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے کہ دنیا والے مصیبتوں میں رہنا سیکھ جائیں۔ رام اور سیتا جی کی دُکھ بھری کہانی نے کتنے کروڑ انسانوں کو دکھ سہنے کا خوگر بنایا ہوا ہوگا۔ محمد عربی ﷺ کا یہ واقعہ کہ وہ بھوک کے مارے سات سات دن تک پیٹ پر پتھر باندھ کر پھرا کرتے تھے۔ کتنے دکھیوں کے لیے سہارا بنا ہوگا۔ سیتا جی کی وفاداری نے آٹھ لاکھ سال کے عرصے میں کتنے ارب کیرکٹر بنائے ہوں گے۔ کس قدر عورتوں کو شوہروں پر مرنا سکھلایا ہوگا۔ اور آپ کی مصیبتوں نے کس قدر دکھیا عورتوں کی ڈھارس بندھائی ہوگی۔ اس کا اندازہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے۔

دنیا میں آرام یا خوشی قناعت (CONTENTMENT) کا نام ہے۔ جب مفلس لوگ فاقہ و افلاس کی بدولت زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ جب ہر طرف لالچ اور بے چینی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کہیں قناعت کا نام تک باقی نہیں رہتا۔ تو اللہ رامچند رجی جیسا انسان دنیا میں بھیج دیتا ہے جو اپنے آپ کو ہزارہا مصیبتوں میں ڈال کر دوسروں کو زندہ رہنا سکھلاتا ہے۔ اور قناعت کا درس دیتا ہے۔ اگر لوگ دولت مند بن جائیں۔ تو خدا کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اور اگر بھوکے ہو جائیں تو محمد ﷺ عیسیٰؑ اور رامچند رجی کا نمونہ سامنے رکھ کر بھوک ہی میں روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے پیغمبروں کو دکھوں میں ڈالنے کا مقصد یہی ہے۔ اور رام چندر جی کی زندگی اس لحاظ سے نہایت مکمل ہے

معجزات:

راما کی زندگی میں کافی معجزات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بندروں کا بولنا۔ تخت کا ہوا میں اڑنا وغیرہ۔ اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بائبل اور قرآن شریف ہر دو میں

مذکور ہے کہ موسیٰ کی لاٹھی اژدھا بن گئی۔ دریائے نیل کا پانی دو حصّوں میں بٹ گیا۔ اور درمیان سے خشک سڑک نکل آئی۔ سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اڑا۔ اور حضرت مسیح نے مردے جلائے۔

بعض حضرات اس لیے معجزات کے قائل نہیں کہ موجودہ سائینس ان کی تائید نہیں کرتی۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس ابھی نامکمل ہے۔ ہر روز نئے نئے قوانینِ فطرت (NATURAL LAWS) دریافت ہو رہے ہیں۔ اور ہر انکشاف بجائے خود ایک معجزہ ہے آج سے ۱۰۰ سال پہلے اگر ہمیں کہا جاتا کہ سلیمانؑ اور راما کی طرح لوگ ہوا میں تیریں گے۔ آسٹریلیا اور لنڈن کا درمیانی فاصلہ کہ جو ۱۱۳۰۰ میل سے کم نہیں۔ صرف ستر گھنٹوں میں طے ہوگا۔ اور جرمن اور لنڈن کے گانے ہمیں یہاں آناً فاناً سنائی دیں گے۔ تو ہم ہرگز باور نہ کرتے۔ لیکن آج یہ معجزے ہمارے سامنے ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ سائنس انکشاف کرتے کرتے کبھی نہ کبھی ان قوانین کو بھی دریافت کر لے گی۔ کہ جو معجزات کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ ہر معجزہ کسی قدرتی قانون ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن ابھی ہمارا علم اس قانون کو دریافت نہیں کر سکا۔

برناڈ شا کہتا ہے۔ کہ آج سے ۱۰،۰۰۰ سال بعد دنیا اس قدر آگے نکل جائے گی۔ کہ ہوائی جہاز اور ٹرینیں متروک ہو چکی ہوں گی۔ یورپ کی موجودہ مہذب اقوام کو جاہل اور پسماندہ خیال کیا جائے گا۔ اہل علم گراموفون، ریڈیو اور طیاروں کے متعلق ریسرچ کیا کریں گے۔ اور یہ ثابت کرنا کہ یہ چیزیں کبھی موجود تھیں۔ بڑی بھاری کامیابی سمجھی جائیگی۔ یقیناً یہ وہ زمانہ ہوگا۔ کہ جب معجزے کی اصلیت کو ہم سمجھ سکیں گے۔

آج دنیا نے ایتھر میں چند طاقتیں دریافت کر لی ہیں کہ جو انسانی ارادے کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ ایک پتھر سامنے پڑا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ ہوا میں لٹک جائے۔ تو پتھر اس اشارے کی تعمیل کریگا یہ طاقت محض مشقوں، دل کی صفائی اور زیادہ عبادت سے حاصل ہوتی ہے۔ گذشتہ زمانے میں بڑے بڑے صوفیوں اور رشیوں کو یہ طاقت حاصل تھی۔

آج اس زمانے میں بھی ہپناٹزم کے کئی ہسپتال ہندوستان و دیگر ممالک میں موجود ہیں کہ جہاں صرف قوت ارادی سے علاج کیا جاتا ہے۔ میرے ایک دوست زہریلے سانپ کو بغیر دانت توڑے پکڑ لیتے ہیں۔ ایک بنگالی پروفیسر نے ہشیار پور کے ایک سینما میں ایک لڑکی کو بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلق کر دیا۔ اور میں نے خود پاس جا کر دیکھا۔ کہ کوئی رسی یا تار وہاں موجود نہ تھا یہ سب کچھ ان ایتھری طاقتوں کے کرشمے ہیں۔

اس لیے اگر دریائے نیل پھٹ گیا۔ یا راما کا تخت ہوا میں اڑا۔ تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اس لیے یہ ایتھری طاقتیں کہ جنھیں دیوتے یا فرشتے کہا جاتا ہے ان لوگوں کی مدد [illegible] تھیں۔

راما کوئی کتاب نہیں لائے: کیوں؟

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ تمام بڑے بڑے پیغمبر الہامی کتابیں لائے۔ لیکن راما نے کوئی کتاب دنیا کو نہیں دی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک بات کو سمجھانے کے دو طریقے ہیں۔ گفتگو یا عمل،

فرض کیجئے کہ دو آدمی خدا کی شان و شوکت کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ ایک کسی فلسفی کے پاس جاتا ہے اور دوسرا سمندر کے ساحل پر۔ سمندر خاموش ہے۔ لیکن ہزاروں میل تک نیلگوں پانی کی دہشت ناک دنیا اور اس پر اژدہے کی طرح بل کھاتی اور پھنکارتی ہوئی۔ ہولناک موجیں خدا کی عظمت کا جو نقش اس کے دل میں بٹھائیں گی۔ وہ فلسفی کی لمبی چوڑی دلیلوں سے ہزار درجے زیادہ پائدار ہوگا۔ حضرت مسیح نے تقاریر کے ذریعے دنیا میں ہیجان اٹھایا۔ حضرت داؤد نے وہ میٹھے اور سریلے گیت گائے کہ دنیا وجد میں ڈوب گئی۔ محمد عربی ﷺ نے اپنی فصاحت و بلاغت اور بہترین عمل سے ایک جہان کو اپنا گرویدہ بنایا۔ اور راما ایسے واقعات میں ڈال دیا گیا۔ کہ اس کی زندگی کی کہانی کروڑہا انسانوں کے کیرکٹر بنا گئی۔ خدا نے اسے کوئی کتاب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس لیے وہ خود سرتاپا کتاب تھا۔ راما میں والدین کی تابع داری، رحمدلی، وفاداری، محبت، خلوص، بلند ہمتی، متانت، پاکیزگی اور دیگر خوبیاں توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ کہ ہر غیر متعصب انسان تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اختلاف:

راما کی تمام کہانی میں مجھے صرف ایک جگہ اختلاف ہے کہ ایودھیا میں تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے بعد راما نے سیتا کو محض اس لیے شہر سے نکال دیا تھا۔ کہ وہ چھ ماہ راون کے گھر رہ چکی تھی۔ چتا پر جلنے۔ اور اگنی دیوتا کی شہادت صفائی کے بعد اس واقعہ پر یقین نہیں آتا۔ میں یہ کیسے مان لوں۔ کہ وہ راما جس کی شاندار اور قابلِ ناز زندگی تمام

عیوب سے پاک تھی۔ اس سیتا کو پہلو سے جدا کر ڈالے۔ جس کی وفاداری، جان نثاری اور خالص و مقدس محبت آج تک بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہے۔ جس نے شاہی محلات کے آرام کو چھوڑ کر سالہا سال کے لیے جنگل کی تکالیف راما کے ساتھ مل کر کاٹیں۔ سیتا جیسی بلند دیوی کو راما جیسا بلند دیوتا گھر سے نکال دے۔ میں کبھی نہیں مان سکتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں شاعر نے کہانی میں ڈرامائی رنگ بھر دیا ہے۔ ہمارے جذبات کو ابھارتے ابھارتے حقیقت کھو دی ہے۔ اور ایک شاعر کے ہاں اتنا کچھ قابلِ اعتراض نہیں۔

خاتمہ:

بالآخر میں آپ سے یہ التماس کروں گا۔ کہ آپ شیکسپیئر کے ڈراموں، ہارڈی کے ناولوں، ٹیگور کے جواہر پاروں، اقبال کے نغموں اور ورڈسورتھ کے فطرتی گیتوں کے ساتھ بالمیک کی اس لاثانی نظم رامائن کا بھی مطالعہ کریں۔ شاعر کا تخیل اس قدر بلند، مناظرِ فطرت کا نقشہ اتنا دلفریب اور اندازِ تحریر اتنا دلچسپ ہے کہ ہر قدم پر بے ساختہ کہیں آہ اور کہیں واہ نکل جاتی ہے۔

ان الفاظ کے بعد میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ تمام مذاہب کے رہبروں کی عزت کرنا سیکھئے کہ انسانی اخلاق کا یہ پہلو بہت نامکمل پڑا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جب دنیا کے ان بڑے بڑے رہنماؤں کے نام ہمارے سامنے لیے جائیں۔ تو ہمارے سر تعظیماً جھک جائیں۔ اور دل جذباتِ عقیدت و ارادت سے چھلکنے لگیں۔ وقت آن پہنچا ہے۔ کہ ہم مذاہب کی خود ساختہ اور تنگ حدود سے نکل کر ایک عالمگیر

برادری کی بنیاد ڈالیں۔ کہ جس میں ہر مذہب کے نیک لوگ شامل ہوں۔ تا کہ ہماری دنیا بجائے فتنہ وفساد کے امن وسکون کا گہوارہ بن جائے:

اٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہے جو کبھی وہ بہار پیدا کر
جمی ہوئی ہے دماغوں پر برف مدت سے
دلوں میں دولتِ برق وشرار پیدا کر

[مطبوعہ: سہ ماہی مشعل مجلّہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور بابت نومبر ۱۹۴۱ء]

☆☆☆

تاریخ بُت پرستی

کسی قوم نے آج تک کسی مورتی یا بت کو خدا کا شریک نہیں بنایا۔ اور نہ اسے خالق و رازق تصوّر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی مقدس یا بڑے انسان (پیغمبر، رشی، بزرگ، عالم، فاتح، جرنیل وغیرہ) کی مورتی محبت کی خاطر یا اس کی یادگار قائم رکھنے کے لیے بنائی گئی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کی عبادت شروع کر دی۔ اسی طرح کسی بڑے انسان کی قبر کی تعظیم عبادت کی حد تک پہنچا دی گئی۔ بعض اقوام نے آسمانی فرشتوں کے فرضی مجسمے زمین پر بنائے۔ یونانیوں نے ابر و باراں، عشق، غضب، محبت، بڑھاپا، جوانی، و دیگر مناظر قدرت و جذبات انسانی کو مجسموں کی شکل دی۔ کیوپڈ، جوو، وینس وغیرہ یونانی علم الاصنام (GREEK MYTHOLOGY) کی یادگار ہیں۔

چونکہ اقوام عالم کے ہاں خدا کا تصور ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ اس لیے مختلف ممالک میں مختلف خداؤں کی مورتیاں بنائی گئیں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند اقوام کے خداؤں کا یہاں مختصراً ذکر کریں۔

ا۔ صابئین یا آفتاب پرست قوم کا نظریہ:

ان لوگوں کے خیال میں خدا نے پہلے فرشتے بنائے۔ اور فرشتوں نے چاند،

سورج وغیرہ پیدا کیے۔ انسانی تکالیف یا مسرتیں ستاروں کی گردش سے واقع ہوتی ہیں۔ زمین پر زندگی سورج کی روشنی کی وجہ سے ہے۔ ستارے جسم ہیں۔ اور فرشتے ان کی روح، ان لوگوں نے فرشتوں کی مورتیاں بنالیں۔ آہستہ آہستہ یہی مورتیاں مقصدِ عبادت بن گئیں۔ اور خدا کا تصور غائب ہوگیا۔

(۲) یونانیوں کے ہاں اللہ نے صرف عقل اول پیدا کیا۔ اور عقل نے نفس کی تخلیق کی۔ اس نفس نے تمام دنیا کو بنایا۔ یونانی تین چیزوں کی پوجا کرتے تھے۔ اللہ، عقل اور نفس۔

(۳) یہودیوں کا خیال یہ تھا، کہ بڑے خدا نے چھوٹا خدا اور چھوٹے خدا نے ایک اور خدا پیدا کیا۔ یہ تینوں مل کر ایک بن گئے۔ اور ہر سہ دنیا پر حکومت کررہے ہیں۔

(۴) ہندوستان میں بڑے بڑے تین خدا ہیں۔ برہمو، وشنو، اور شو، جن کی کوئی خاص شکل نہیں۔ ہندوستان کے قدیم فلسفہ سے پتہ چلتا ہے کہ خدا دراصل ایک تھا۔ یہ تین نام اس کی تین صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

مثلاً جب خدا نے دنیا کو پیدا کیا۔ تو وہ برہمو (خالق) کہلایا۔ جب کائنات کی نگرانی کا خیال پیدا ہوا تو وہ وشنو (محافظ، نگراں) بن گیا۔ جب اس میں قہاریت کا وصف آیا تا وہ شو کہلایا۔ بعض ہندوستانی مورتیاں تین سروں والی دیکھی گئی ہیں۔ یہ سر ان تین خوبیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۵) اہل چین بھی تثلیث (TRINITY یعنی تین خداؤں) کے قائل ہیں انھوں نے اس تثلیث کے لیے ''اوم'' کا لفظ وضع کیا ہے۔ اوم میں تین حرف ہیں۔ الف، واؤ، میم۔ الف کا مخرج آخر حلق ہے۔ واؤ درمیان سے اور میم ہونٹوں سے نکلتا ہے۔ تو

گویا ان کے نزدیک خدا اول، وسط اور آخر میں ہر جگہ اور ہر وقت پر موجود ہے۔ اور موجود رہے گا۔

(۶) قدیم ایرانی تین خداؤں یعنی سحر وس، وسیط اور مخلص کی پرستش کرتے تھے۔ یہ عقیدہ مصریوں سے لیا گیا۔

(۷) روشر مسیح سے پہلے بھی تین خداؤں کے قائل تھے۔

(۸) جزائر اوقیانوس اور میکسیکو کے باشندے باپ، بیٹا اور روح القدس کے قائل تھے۔ بیٹے کا نام ''باکاب'' تھا۔ جو ایک کنواری لڑکی کا بیٹا تھا۔

(۹) اہل نیپال قدیم زمانے میں اِندرا کی پوجا کرتے تھے۔ یہ ایک مقدس انسان تھا۔ جسے حکومت نے سُولی دے دی۔ اور وہ امت کے گناہ لے کر خود قربان ہو گیا۔

(۱۰) قدیم یونانی خدا کو تین شاخوں والا خیال کرتے تھے۔ اس لیے وہ مذبح پر تین مرتبہ پانی چھڑکتے اور کافوردان کو تین انگلیوں سے پَرتے تھے۔

(۱۱) بعض قدیم ایرانی اقوام ہرمزو (خالق) مترا (شفیع) اور اہرمن (مہلک) کی پوجا کرتے تھے۔

(۱۲) سائبیریا کے لوگ خدائے جنگ اور خدائے محبت کی پرستش کرتے تھے۔

(۱۳) پیغمر اسلام کی آمد سے پہلے کعبہ میں ۳۶۰ مورتیوں کی پرستش ہو رہی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ عمرو بن لحی جب قوم کا سردار بنا۔ اور بلقاء کا سفر کیا تو وہاں ایک قوم کو بت پرستی میں محو پایا۔ عمر وان سے متاثر ہوا۔ اور ایک بت ہبل نامی لا کر کعبہ میں رکھ دیا۔ اور تمام قوم کو بت پرستی کی طرف دعوت دی۔ رفتہ رفتہ یہ مرض تمام عرب میں پھیل گیا۔ اور گھر گھر اک نیا خدا بن گیا۔ یہ بت شاہپور ذوی الاکناف (ایک ساسانی

بادشاہ) کے عہد میں کعبہ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ضحاک نے صفاء میں ایک بت ”غمدان“ نامی تیار کیا۔ جسے عثمانؓ نے توڑ دیا تھا۔ کعبہ میں مختلف قبائل کے مختلف بت تھے۔ مثلاً کلب کا وُد، بنی ہذیل کا سواع، بنی مدحج کا یغوث، ہمدان کا یعوق۔ ذوالکلاع کا نسر، ثقیف کا لات، خزرج کا یثرب میں منات، نواحی مکہ میں کنانہ میں عزیٰ، اور بکفر قبائل کے بت صفا و مروہ پر اساف و نائلہ تھے۔

[مطبوعہ: سہ ماہی مشعل مجلہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور بابت: مارچ ۱۹۴۰ء]

☆☆☆

مصر کے ابو الہول یا اہرام

آپ نے بارہا اہرام مصر کا ذکر کتبِ تاریخ میں پڑھا ہوگا۔ یہ اہرام افریقہ کے شمالی حصے یعنی مصر میں آج سے کئی ہزار سال پہلے تعمیر کیے گئے تھے۔

قدیم مصری سلطنت:

ولادتِ مسیح سے تقریباً 5000 سال پہلے ملکِ مصر پر پہلی دفعہ ایک بادشاہ مَغس نامی حکمران ہوا۔ جس کا دارالخلافہ شہر منفس تھا۔ جو دریائے نیل کے دائیں کنارے پر ڈلتا کے قریب بنایا گیا تھا۔ اس کے گرد ایک دیوار طغیانیوں سے بچنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ جواب بھی موجود ہے۔ لیکن وہ شہر مسیح کے 1000 سال بعد یعنی 400 ہجری میں تباہ ہوگیا۔ اس بادشاہ کی حکومت 61 سال رہی۔ اور اس کی موت ایک دریائی گھوڑے کے حملے سے واقع ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر 523 ق م تک مصر پر فرعونوں کے ۲۶ سلسلے حکمران رہے۔ لیکن شروع کے تین سلسلوں سے ہم بالکل ناآشنا ہیں۔

چوتھے سلسلے کے تین بادشاہوں کیوپس (KIOPS) کفرن (KEPHRIN) میسری نوس (MYCERINUS) نے تین اہرام بنائے۔ جو منفس سے پونے چار میل دور ایک بلند میدان میں واقع ہیں۔ جہاں قدیم شاہی قبرستان بھی ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ اہرام دراصل، پرانے بادشاہوں کی قبریں ہیں۔

ان اہرام میں سب سے بڑا140 میٹر اونچا اور 583696 مکعب فٹ ہے۔
اگر پانچ پانچ فٹ قد کے 93 آدمی اوپر نیچے کھڑے کر دیے جائیں تو وہ اس ابوالہول کے سر تک جا پہنچیں گے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی تیس سال تک کام کرتے رہے۔
دوسرا اہرم کفرنؔ اور تیسرا میسری نوس کے لیے بنایا گیا تھا۔ جن میں یہ بادشاہ مدفون ہیں۔

یہ اہرام سیاحوں کی دراز دستی، بارشوں، آندھیوں اور دیگر حوادث کی وجہ سے کم ہو رہے ہیں۔ چوٹی کے پتھر گر رہے ہیں۔ تاہم یہ دنیا کی بلند ترین تعمیریں خیال کیے جاتے ہیں صرف کیوپسؔ کے ہرم میں پانچ کروڑ مکعب میٹر پتھر خرچ ہوا ہے۔ پتھر کی بعض سلیں تیس تیس فٹ لمبی ہیں۔ یہ بڑے بڑے پتھر کس طرح چوٹی پر پہنچائے گئے۔ ہنوز ایک معمہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کروڑوں من مٹی کی سڑک چوٹی تک بنائی گئی تھی۔ اور ہزاروں مزدور پتھروں کو رسیوں سے باندھ کر اوپر کھینچتے تھے۔

ان اہرام کے قریب پتھر کا بہت بڑا سر بنا ہوا ہے۔ یہ سر قدیم مصریوں کے ہاں ھار ماخیس (HARMAKHIS) خدا کا نمائندہ اور سورج دیوتا کا مظہر تھا۔ اس بُت کا باقی جسم ریت میں دب گیا تھا۔ حال ہی میں ریت کو ہٹایا گیا تو معلوم ہوا کہ جسم شیر کا ہے۔ جو لیٹا ہوا ہے۔ اس مجسمہ کی بلندی ۱۹ میٹر اور ہر کان ایک ایک میٹر لمبا ہے۔ (میٹر ۳۹ انچ کا ہوتا ہے)

اٹھارویں سلسلہ کے ایک بادشاہ امنوفس (AMENOPHIS) نے دو مجسمے بنائے۔ ایک مجسمے کا کچھ حصہ ایک زلزلے کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد طلوعِ خورشید کے وقت ہر روز اس ٹوٹے ہوئے مجسمے سے تار چنگ کی آواز نکلتی تھی۔ مصریوں کا خیال یہ تھا۔ کہ خدائے صبح آرور (AURORE) کا لڑکا ممنؔن اپنی

ماں (صبح) کی آمد پر تسبیح و تہلیل کے گیت گاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد قیصر روم سپٹنی (SEPTINEE) نے اس مجسمہ کی مرمت کرائی۔ تو وہ آوازیں بند ہو گئیں۔ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ شکست کی وجہ سے ممنن میں ایک شگاف آ گیا تھا۔ جس میں رات بھر شبنم گرتی رہتی۔ اور جب سورج کی شعاعیں اسے بخارات میں تبدیل کر کے باہر نکالتیں۔ تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ ان ہر دو مجسموں کی شکل بڑے بڑے انسانوں کی سی تھی۔ کہ جو پتھر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

[مطبوعہ: سہ ماہی مشعل مجلّہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور بابت: مارچ ۱۹۴۰ء]

☆☆☆

فلسفۂ غالبؔ

غالبؔ پر ہزاروں اہل علم نے لکھا اور لکھتے رہیں گے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ عبدالرحمن مرحوم بجنوری اور حضرت حالیؔ جیسے مایہ ناز اُدبا نے جس مضمون پر خامہ فرسائی کی ہو وہاں اضافہ کی گنجائش مشکل ہے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں ابھی ہزاروں نئے معانی اور پیدا ہونے ہیں۔ ابھی سینکڑوں عبدالرحمن آنے ہیں۔ جو غالبؔ پر دل کھول کر لکھیں گے۔ اپنی وسعت تخیّل، بلندی ادراک اور فلک پیما تحقیق کا ثبوت دیں گے۔ اور چلے جائیں گے۔ مگر غالبؔ کی ہستی دماغِ دنیا میں ویسی کی ویسی معمّا اور عقدہ لاینحل رہے گی۔

(۲) یورپ کی مادیت فریب عظمت کا دماغ عالم پر یہ ہوشربا اثر پڑ رہا ہے۔ کہ زمین یورپ کا ایک متوسط القابلیت فرد اپنے ملک کی صحافت کا آفتاب نصف النہار بن کر نمودار ہو رہا ہے۔

ادھر مشرقی دنیا میں صدیوں کی زندانیت نے یہ کیفیت پیدا کر دی کہ بہت سے گراں بہا جواہر آغوش صدف ہی میں نہاں رہے ہیں۔ بعض دیگر آسمان شہرت پر چمکنا چاہتے ہیں لیکن تسلطِ اغیار کی ظلمت بار گھٹائیں ان کی شعاعوں کو روک لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مغرب میں غروب ہو جاتے ہیں۔

(۳) ملٹن، شیکسپئر، ورڈس ورتھ، گولڈسمتھ، پوپ، سپنسر، الیگزنڈر، والٹر سکاٹ، تھامس کیمبل، چارلس وولف، تھامس گرے، تھامس مور، اور اسی طرح کی لاتعداد ہستیاں محافل مغرب میں انجمن آرا ہوئی ہیں۔ فضائے گردوں ان کی صدائے شہرت

سے گونج رہی ہے۔ روز افزوں سلسلۂ اشاعت، ان کی شہرت میں چار چاند لگا رہا ہے۔ لیکن کچھ محققین کی نگاہوں کی واماندگی بانگِ دہل اعلان کر رہی ہے اس بانگِ شہرت کی حقیقت بانگِ دہل سے زیادہ وقیع نہیں۔

ادھر مزارِ مشرق میں انشاؔ، مومنؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، آتشؔ، جراتؔ، نظیرؔ، سودا، میر تقی میرؔ، داغؔ، میر درد، امیرؔ مینائی، خسروؔ، ذوقؔ اور دیگر لاتعداد حقائق آرا ہستیوں کی لاشیں خموشی کی چادریں اوڑھے محوِ خواب ہیں، کبھی کبھی چادر اٹھ جاتی ہے۔ ان کی لاشوں میں خفیف سی حرکت آ کر پھر جمود و سکون طاری ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا کی بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے اٹھنا چاہتے ہیں۔

یاللعجب! سرزمین مغرب کی ہر پست سے پست آواز کرہ ُہوا کو چیرتی، سمندروں کو ماپتی، کہساروں کو عبور کرتی ہوئی اقصائے عالم میں گونج جائے۔

لیکن اہل مشرق کی گوش شگاف صدائیں کوہ ہمالیہ کی بلندیوں کا بھی مقابلہ نہ کر سکیں اور سر پٹک کر رہ جائیں۔

(۴) غالبؔ میدان ادب میں کودا، جولانی کی، اَنا ولا غیری کے حقیقت نواز نعرے لگائے۔ خود تماشہ بینوں کی ایک بڑی جماعت نے اس طرف توجہ کرنا تضیع اوقات خیال کیا۔ مجالس ادبیہ کی بے اعتنائی، قلتِ فہم کی عمومیت نے زبان بندی کے سخت احکام جاری کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بلند اور سریلی آواز مدتِ مدید تک ساز کے پردوں میں ہی دبی رہی۔ اور بڑی بڑی اصلیت شناس طبائع زمانے کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

(۵) آخر زمانے نے پلٹا کھایا۔ وہ لیل و نہار بدلے۔ جہالت کی تاریکیاں کھلنے

لگیں۔ بے اعتنائی کے حجابات وا ہوئے۔ آفتاب حقیقت ضیا پاشیاں کرنے لگا۔ جستجوئے اصلیت کا خون ہر رگ میں متموج ہوا۔ دل صداقت کے لیے بیتاب حق نیوش کان ہمہ تن متوجہ ہوئے۔ تو ایک میٹھی سریلی اور بلند آواز سنائی دی۔ جس سے ہر پیر و جوان وجد میں آ کر رقص کرنے لگا۔ دل جاگ اٹھے، کان کھل گئے۔ رگ رگ میں وہ پیاری آواز سرایت کر گئی۔ ریشہ ریشہ میں وہ نغمہ ہوشربا ثبت ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہر ایک فرد مجسم نغمہ بن گیا۔

ہوا نے آ کر اس راگ کو اپنی آغوش میں لے لیا پھر کوہ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں کو عبور کر کے زمین یورپ میں پہنچی۔ اہل یورپ جاگے۔ اس آواز کی طرف کان لگائے پھر دلوں کو متوجہ کر لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہو گیا کہ مغرب کے ہر متمدن خطہ سے اس نغمہ کی صدائے بازگشت اہل ہند کو سنائی دینے لگی۔ اور آج بلا مبالغہ یہ حالت ہے کہ سوادِ ارض کا کوئی حصہ نغمہٗ غالبؔ سے محروم نہیں لطف آ جائے گر غالبؔ آج نقاب خاک کو چہرے سے اتار کے ہمالہ کی بلندیوں پر چڑھ جائے اور ایک دفعہ پھر وہی پیاری آواز ہاں وہی دل ربا نغمہ محوش فریب سرود و اہلیان عالم کو سنا دے جو کسی وقت ہجوم بے اعتنائی میں عمر رباب سے نکلا تھا۔ اور اب تک فضائے دوراں میں محو ترنم ہو کر اربابِ ذوق کی التفات کا ملتجی ہے۔ یعنی:

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

ملاحظہ فرمائیے تراکیب فارسی و اضافات عالیہ کا ایک طوفان امڈا چلا آتا ہے۔ الفاظ میں شان و شوکت، مضامین میں بلندی، خیالات کی پرواز، تسلطِ ادراک سے بہرہ ور اگر ان اشعار کو ایک ایسے خوفناک جنگل سے تشبیہ دی جائے۔ جہاں

صدیوں پرانے پیڑ اگے ہوں جھاڑیوں کانٹوں اور گھاس کے ہجوم سے نظر ایک فٹ تک بھی کام نہیں کر سکتی۔ تو غالباً مجھے معاف کیجئے گا۔

حضرت غالبؔ کے فلک پیما خیالات حیطۂ الفاظ سے کہیں ورا الورا جب سنگین اور ٹھوس الفاظ کی ذرہ پہنے اضافات، مسند الیہ کے ہیبت ناک نیزوں سے مسلح معمانواز شکل میں ظاہر ہوتے ہیں تو میری ادرا کی نگاہیں چندھیا جاتی ہیں۔

اب ذرا سادگی بھی ملاحظہ ہو:

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بار ہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پھر کچھ اب کے سر گرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

☆

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطہ پاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

واہ واہ کس قدر ملیح سادگی ہے۔ دوشیزہ سحر کا متبسم چہرہ آفتاب طالع کی پہلی کرن، صبح کی دھندلگی میں یاسمن کی وجیح صورت، مہتاب کی کیف انگیز ضیا پاشی، چاندنی میں سبزے پر ہلکے ہلکے قطرہ ہائے شبنم، اس قدر بہجت افزا نہیں۔ یقیناً نہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ دو مختلف النوع ٹکڑے ایک تخیل کے نتیجہ ہیں۔

حضرت مرزا بعض اوقات سادگی میں اس قدر بلند ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والے حواس کی شہادت کو ناقابل اعتبار سمجھنے لگتے ہیں۔ شارحین مرزا غالبؔ بہت سے اشعار کو عمیم الفہم خیال کر کے تشریح سے مستغنیٰ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یوں نہیں۔ مثلاً:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شارحین اس کا معنیٰ یوں کیا کرتے ہیں۔

''مرزا غالب تکالیف عالم سے گھبرا کر موت کی تمنا کرتے ہیں۔ رات بھر انتظار موت میں جاگتے ہیں۔ آخر اپنے آپ کو یوں سمجھاتے ہیں۔ مرزا! موت کا ایک دن مقرّر ہے اسی دن آئے گی اس کی انتظار میں مفت نیند خراب نہ کر۔''

گو یہ معنی کسی حد تک صحیح ہیں لیکن مرزا کی بلندی خیال کی قامت پر راست نہیں اترتے۔ بہتر ہوگا اگر یوں تشریح کی جائے۔ ''غالب واقعی موت کا تو ایک دن مقرر ہے۔ اس دن آئیگی لیکن کم بخت نیند کیوں نہیں آتی کیا اس کے لیے بھی کوئی

خاص وقت (دن یا رات) مقرر ہے۔"

اہل فہم بتائیں گے کہ کونسی تشریح خیالات غالب کی زیادہ ترجمان ہے۔

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

حضرت حسرت جیسے ماہر فن یہاں آ کر ڈگمگا جاتے ہیں۔ عبدالرحمن بجنوری مرحوم، جناب سہا اور طباطبائی جیسے کامل الذکا کچھ کا کچھ کہہ جاتے ہیں۔

معروف معنی یہ ہیں "قیامت کا فتنہ تیرے قد سے کم ہے"

حالانکہ یہ معنی تو قدِ آدم" کو بیکار کردیں گے۔"

ایک معنی اور بھی ہیں جو تکلف سے خالی نہیں۔

تشریح۔ "مقدمہ" (۱) سرو قامت۔ سیدھا قد

(۲) دو لکڑیاں ایک فٹ تو ایک کو دوسری سے چھ انچ گھٹا دو تو باقی چھ انچ بچے گی۔ اگر ایک لکڑی دوسری سے بارہ انچ گھٹا دی جائے تو اس کا وجود صفر ہو جائے گا۔

(۳) معشوق کا قد سیدھا اور قد آدم حقیقت ہے۔ او محشر رفتار، محشر قامت تیرے سیدھے قد سے قیامت ایک قدِ آدم جتنی کم ہے۔ یعنی صفر ہے۔ کیونکہ قد آدم سے قد آدم گم کر دو تو وہ ظاہر ہے کہ صفر ہی ہو جائے گا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

معروف معنے، یار میرے متعلق پوچھ رہا ہے۔ کوئی صاحب کہیں کہ کیا بتلاؤں میں تو اس کے دیدار میں اس قدر محو ہوں کہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔

یہ ایک پامال خیال ہے۔ شہریارِ اقلیم سخن کے زیبا نہیں۔

تشریح:۔ (مقدمہ) عشاق کو معشوق کے سامنے اظہار محبت کی بہت کم جرأت ہوا کرتی ہے۔ بقول کسے

زبان ہل نہ سکی رعب حسنِ جاناں سے

بیان ہو نہ سکا میرا مدّعا مجھ سے

کوئی عاشق معشوق کو علی الاعلان یہ نہیں کہہ دیا کرتا کہ میں تمہارا عاشق ہوں۔ غالبؔ کہتا ہے کہ آج بڑی مدّت کے بعد دلبر مجھ سے میرے متعلق پوچھ رہا ہے۔ زہے قسمت خوشا نصیب۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اُسے جواب کیا دوں۔ ہوں تو اس کا عاشق لیکن یہ کہنے کہ جرأت کہاں سے لاؤں کہ اس پیارے سوال کا جواب کیا دوں کہ سچ بھی ہو اور آں جناب بگڑنے بھی نہ پائیں۔

دونوں تشریحوں میں ارض وسما کا تفاوت ہے۔

پہلی تشریح محض فرسودہ اور دوسری تشریح ایک ایسی جذباتی کیفیات کا اعلان کرتی ہے۔ جس کے الفاظ حامل نہیں ہو سکتے۔ جس سے ہلکا ہلکا کیف مترشح ہوتا ہے۔ الغرض یونہی اس ماہر رموز کائنات نے سادگی میں رنگینی کے جلوے دکھائے۔

(۳) اب ذرا دوسری طرف دیکھیے، جہاں مرزا نے دانش و ذکا کے لطیف ہاتھوں سے باریک ترین سوز کاری کی ہے۔ جہاں عقل لڑکھڑا جاتی ہے۔ قوائے ذہنیہ ڈگمگا جاتے ہیں۔ حواس الفاظ کی پیچیدہ گھاٹیوں میں یوں گم ہوتے ہیں کہ منازل معانی تک پہنچنا سالوں کا سفر ہو جاتا ہے۔ لوگ ان دشوار گزار راستوں کے مصائب کا شکار بنتے ہیں۔ سمندِ تخیّل بھدا ہو جاتا ہے، طائر ادراک شاخساروں میں پھنس کر رہ

جاتا ہے۔ لیکن پھر مشاہدہ بتلاتا ہے کہ لوگ جوق در جوق اسی وادی کو روانہ ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ منزل معانی اس قدر دلکشا، فرحت افزا اور عشرت انگیز ہے کہ وہاں کا تصور ان گھاٹیوں کو آسان ترین بنا دیتا ہے۔ آؤ ذرا ہم بھی سیر کریں۔

(۱) دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

سرسری نگاہ ڈالیے تو رقیب کا نامہ بر ہونا سمجھ آتا ہے۔ لیکن سطحی پردہ اُٹھائیے تو نامہ بر رقیب کا رنگ بدلے ہوئے ہے۔

(۲) یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

مصرع اوّل معشوق کی آمد نہ آمد کا تذکرہ معلوم ہوتا ہے حالانکہ غالبؔ تکالیف سے گھبرا کے تمنائے قضا کرتا ہے۔ قضا آنے سے انکاری ہے، با ایں ہمہ دوسرے مصرعے میں قضا کی ہٹ دھرمی کا شکوہ ہے۔

(۳) کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

حضرتِ حسرت کی تشریح:

زندان غم اس قدر تیرہ و تاریک ہے کہ روزنوں میں روئی کی سفیدی نورِ صبح سے کم تسلی نہیں دلاتی۔ یعنی اس طوفانِ تاریکی میں روئی کی جھلک نورِ صبح معلوم ہوتی ہے۔

اس پر یوں تنقید کی جا سکتی ہے کہ تاریکیِ زنداں میں سفیدیِ پنبہ سے کیوں نظر آئی

کہ باعثِ اطمینان ہے یا صرف تصورِ سفیدی اس قدر سفید نکلا۔

تشریح: مقدمہ (ا) صبح کے وقت سفیدی بے اندازہ ہوتی ہے غالب کہتا ہے کہ میرے زندانِ غم میں بے حد تاریکی ہے روزنوں میں روشنی کو روکنے کے لیے اس قدر پنبہ دیا گیا ہے کہ وہ پنبہ مقدار میں سفیدی صبح سے کم نہیں۔

عموماً اہل ذوق نے غالبؔ کو شاعرانہ نقطہ خیال سے دیکھا ہے۔ دیگر محاسن کی طرف بہت کم متوجہ ہوئے۔ ورنہ کلام غالبؔ پر ایک اجمالی اور سطحی نظر اس امر کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ مرزا شاعر ہونے کے علاوہ چند ایک ایسے محاسن کا مرکز بھی تھے کہ جن سے دیگر شعرا بہت کم بہرہ یاب ہوئے۔ ان محاسن کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

حضرت جوشؔ کچھ عرصہ پہلے کے شاعر ہیں۔ آپ خودی سے اس قدر بے گانہ ہیں کہ ہر ایک ذلّت پر قناعت کرنے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

نگاہِ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے

سلام اس نے ہمارا لیا، لیا نہ لیا

مجنوں نے لیلیٰ کے آستانے پر جبیں سائی گوارا نہ کی۔ شب و روز صحراؤں بیابانوں میں مارا مارا پھرا۔ آبادیوں سے دور اور اقارب سے مستغنی ہوا۔ حوادثِ کہنہ کا شکار رہا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ درِ لیلیٰ پر سگ و دربان کے عتاب کو گوارا کرے خود فروش مجنوں کی اس حرکت پر سیخ پا ہوتے ہیں اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا

اس کو لیلیٰ ہی کے دروازے پر مر جانا تھا

حضرت داغ خودی کی جنس گراں مایہ سے پورے محروم نہیں ہوئے۔ آپ گوارا نہیں فرماتے کہ حیات و ممات کے تمام اختیارات محبوب کے قبضے میں دے دیے جائیں۔ شاعر کا دل خانۂ دلبر ہوا کرتا ہے۔ داغ محبوب کے سامنے ایک شرط پیش کرتے ہیں۔ کہ بحالتِ عدم تسلیم مکان خالی کر دینے کا نوٹس دیتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے:

یہ دل ہے آپ کا گھر شوق سے لیکن
سکون و راحت وصبر وقرار جاں کی طرح

مرزا صاحب ہٹ کے پکے، من کے ضدی، جبیں سائی سے کہیں بالا ہر ہر ادا کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پتھر کا جواب پتھر، اینٹ کا اینٹ، سے دیتے ہیں۔ وہ ناراض ہیں تو بلا سے۔ بگڑے ہیں تو بھاڑ میں، لیکن خود داری کی ارزانی ناگوار ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

آپ نہ تو سرِ راہ بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ نہ وسائل کی جستجو میں حیران پھرتے ہیں۔ بزم جاناں کا شوق نہیں، تماشائے بام آرائی ہے۔ ہوس نہیں، نہ تمنائے وصل بے تاب کرتی ہے۔ اور نہ دردِ فراق ستاتا ہے۔ کوہِ وقار بن کر بیٹھے ہیں۔ کسی نے کچھ پوچھا تو نہایت بے اعتنائی سے فرمایا۔ ارے میاں:

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ مرزا نعمتِ خیال سے ابداً و سرمداً محروم ہو گئے، نہیں۔ آپ ملنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ابتدا حبیب سے ہو۔ واہ رے خودداری:

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

استدلال غالبؔ:

مرزا غالبؔ کا طرزِ استدلال کچھ انوکھا ہے۔ آپ کوئی بات بلا دلیل نہیں کہا کرتے تھے شعرا عموماً اپنے دعاوی کو مدلل بنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ لیکن مرزا کا استدلال مقابلتاً نہایت عالی پائے کا ہوتا ہے۔ بعض حضرات تو عشق کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے ہیں۔ غش آ جاتا ہے تکالیف کا تصور تک انھیں چونکا دیتا ہے۔ الفت کے اسٹیج پر لباسِ زہد میں نمودار ہو کر اہالیان عالم کو یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

دوستی بد عہد ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

ذوقؔ سوزِ محبت پر مرتے ہیں۔ کاوش غم کا لطف لیتے ہیں تصور حبیب میں پہروں محو رہتے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے غافل ایک صورت سے دل باندھ رکھا ہے۔ آپ نہیں چاہتے کہ اس راحت عظمیٰ سے بقول کسے:

دِل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
اس کے میں قربان جس نے درد یہ پیدا کیا

اربابِ دنیا محروم ہیں انھیں اپنے خصوصی انداز میں پابندِ الفت ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن کسی قدر بے دلیل:

وہ دِل کہ جس میں سوزِ محبت نہیں ہے ذوقؔ

بہتر ہے اس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

ذوقؔ کے آتے ہی مرزا اسٹیج پر آتے ہیں۔ بات تو وہی کہتے ہیں لیکن استدلال اس قدر نفیس ہے کہ ہر دل میں کھبا جاتا ہے۔ سامعین کے چہرے متاثر ہوتے ہیں۔ ہر لب پر دردِ آہِ مستِ خرام نظر آتا تھا۔ کوئی انسان تفکّر سے خالی نہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی دھن میں محو ہے۔ کوئی دل غم سے بے گانہ نہیں۔ اور نہ ہو سکتا ہے مرزا اس عندیہ کو سمجھ گئے۔ ملاحظہ ہو! کس پیارے انداز سے توجیح پیش کرتے ہیں:

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ہر انسان پیری میں جوانی کی تمنا کرتا ہے۔ عمر گذشتہ کو کون ڈھونڈے کہاں سے ملے۔ امیر مینائی نے اس کا پتا خراباتوں میں دیتے ہیں:

عمرِ رفتہ کو عبث شیخِ حرم روتا ہے
ڈھونڈ لے آکے جوانی کو خراباتوں میں
یہ میکدہ ہے کہ کوئی طلسم ہے ساقی
جو آئے پیر کی صورت گئے جواں کی طرح

حضرت ذوقؔ کافی کم ہمت نظر آتے ہیں۔ حد تلاشِ عمر کی گھاٹی کو اس قدر ناممکن العبور سمجھتے ہیں کہ اس میں گام کشائی کرنے کو زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف خیال فرماتے ہیں:

سُراغ عمرِ گذشتہ کا ڈھونڈیئے گر ذوقؔ
تمام عمر گذاری ہے جستجو کرتے

واہ رے بلند ہمت مرزا! تیرے ہاں عقول کی انتہائی بلندیاں منازل اولی ہیں۔ سرحدِ ماوراالادراک تیری فلک پیما ہمت کے سامنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ تیرے تجسس پر نثار، تیری جستجو کے صدقے آخر تُو نے عمرِ رفتہ کا سراغ لگا ہی لیا۔

ع گذشتہ عمر ملکِ فنا میں چلی گئی

مرزا مرکر عمرِ گذشتہ سے استقبال کی امید کرتے ہیں کیوں نہ ہو عرصۂ ہستی میں برسوں ہم نشین رہے۔ ایک دوست کو دوسرے سے استقبال کی امید رکھنا بجا!

آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم
عمرِ گذشتہ ایک قدم استقبال

علما کا فسوں اس قدر عالمگیر ہو رہا ہے کہ مسلم تو بجائے خود غیر مسلم بھی آخرت کی اہمیت کو محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ مسلمانوں پر اس قدر خوف طاری ہو چکا ہے کہ ہزار عابد و زاہد ہوں، لاکھ بنی نوع انسان کی بہبود میں دن رات ایک بنا دیں۔ تب بھی جہاں کہیں لفظ عقبیٰ کسی منہ سے نکلا رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور ہرے ہرے پکارنا شروع کر دیا۔ امیر مینائی، باآں ہم زہد و تقویٰ، اللہ میاں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ فرماتے ہیں:

کریم تجھ کو سمجھ کر گناہ کرتے ہیں
گناہ میرے سزاوارِ انتقام نہیں

اور

پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

ایک جگہ خلّاقِ عالم کو دُنیا دارانہ مذاق کا انسان سمجھ کر بڑے مزے کی بات

کہہ جاتے ہیں:

اونچے اونچے مجرموں کی ہو گی پرسش حشر میں

کون پوچھے گا مجھے میں کن گنہ گاروں میں ہوں

امیرؔ کو اپنی سیہ کاری پہ اتنا ناز اور کرامت باری پر اتنا اعتماد ہے کہ فخریہ کہتے ہیں:

فرشتوں سے کہو اتنی قیامت میں سزا کیسی

کہیں چھپ چھپ کے زاہد مل نہ جائیں بادہ خواروں میں

الٹا اللہ کے بندوں پر پھبتیاں اڑاتے ہیں:

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے

مغفرت بولی ادھر آ میں گنہ گاروں میں ہوں

حضرت حافظؔ بھی اسی جنوں میں گرفتار ہیں:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو

کہ مستحقِ کرامت گناہ گار انند

مرزاؔ باآں شان وشکوہ عرصہ محشر میں حاضر ہوتے ہیں۔ نامۂ اعمال کھلتا ہے تو دیکھتے

ہیں کہ سفیدی نام کو نہیں تو آپ سٹ پٹا جاتے ہیں۔ لیکن فوراً حواس سمیٹ کر اللہ میاں

کے انتظام قابلیت پر اعتراض جڑ دیتے ہیں۔ واللہ خوب سوجھی!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

غضب کا استدلال ہے ممکن ہے یہی مرزاؔ کی نجات کا باعث بن جائے حضرت گرامیؔ

فرماتے ہیں:

چشم است سیہ مستے دل ہست سیہ کارے

دردے بہ جگر گردد بیمار ز بیمارے

اتنی جرأت تو نہیں ہو سکتی کہ تخیلِ غالبؔ کو پروازِ گرامیؔ پر ترجیح دے دوں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ علمِ سبقت مرزا کے ہاتھ میں ہے:

کم نہیں نازشِ ہمتائی میں چشمِ خوباں

تیرا بیمار برا کیا ہے اگر اچھا ہو

نظیریؔ نے ایک غزل میں دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

حضرت یعقوبؑ فراق یوسف میں بیٹھ کر صرف رویا کیے لیکن بغداد میں منصور کا سر انا الحق کہتے کہتے نذرِ صلیب ہو گیا۔ مکان کی عزت مکیں سے ہوتی ہے۔ خیال فرما لیجیے، دنیائے محبت میں بغداد کس وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا:

کجا کنعان کجا بغدادِ مستاں

انا الحق گو مرے بردارِ او نیست

ہزاروں مشتاق، وسیع بیابانوں، عریض وطویل سمندروں کو عبور کر کے آستانہ کعبہ کو اپنے سجدہ ہائے نیاز سے مخمور کرنے کے لیے بے تابانہ دوڑتے آتے ہیں۔ اسی طرح کوئے جاناں میں صبح وشام عشاق کا جھمگھٹا رہتا ہے۔ لیکن بڑا فرق ہے:

بایں شد کعبہ ہمسنگ کوئے تو ممتاز

کہ حسرت بر در و دیوارِ او نیست

شعریت کا حق ادا کر دیا۔ جس لذت کو میرا دل محسوس کر رہا ہے۔ اسے میں شرمندۂ الفاظ نہیں کرنا چاہتا۔

مرزاؔ کوئے جاناں کا مقابلہ بہشت سے جا ٹھہراتے ہیں:

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے وَلے اس قدر آباد نہیں

ایک موقع پر میں ایک انگریزی منظوم داستان پڑھ رہا تھا جس کا متعلقہ حصہ یوں ہے کہ ایک انگریز اپنی معشوقہ سے رخصت ہو رہا ہے۔ جہاز چلنے کو ہے۔ جوں جوں وقت قریب آتا ہے ان کی نگاہیں شدتِ اضطراب کی اور زیادہ ترجمان ہو جاتی ہیں آخر جہاز لنگر اٹھا کر چل دیتا ہے۔ آخری نگاہیں وہ محبت سے لبریز نگاہیں دو چار ہوتی ہیں اور جہاز سمندر کی وسیع سطح پر محوِ خرام ہو جاتا ہے۔ عاشق انتہائی قلق میں بحری ہوا کو یوں مخاطب کرتا ہے:

Change as ye list ye wind, My heart
shall be
The faithful compass still points
to thee

ترجمہ: اوسمندر کی ہوا جس طرف چاہے سمت تبدیل کر میری لبریز محبت کا دل وفادار قطب نما کی طرح اسی طرف رخ رہے گا۔

میں اس جدت خیالی سے بہت متاثر ہوا۔ کچھ وقفہ کے لیے اس شعر کو پڑھ کر خاموش رہا اور اس جستجو میں لگ گیا کہ غزلیاتِ مشرقین میں اس قسم کی لذت مل جائے۔

کافی حیرانی کے بعد مرزا نے مساعی تجسس کو ختم ہونے کا موقع دیا۔ واہ واہ کس پیارے انداز میں فرماتے ہیں:

تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
قبلہ ایک اور سہی قبلہ نما اور سہی

الغرض اس قسم کی ندرتیں مرزؔا کے اشعار میں کیفِ تبسم کی طرح ارزاں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان پاکیزہ جذبات کو اپنے فرسودہ پامال الفاظ سے ملوث کروں۔ جب تک کہ خزانۂ اُردو میں نئے الفاظ کا اضافہ نہ ہو۔

[غیر مطبوعہ: ۱۹۲۸ء میں لکھا گیا۔]

☆☆☆

محمد حسین آزاد ____ نثر نگار کی حیثیت سے

یوں تو آزاد نے کئی کتابیں لکھیں مثلاً اُردو کا قاعدہ، قصصِ ہند، جامع القواعد، قندِ پارسی، سُخندانِ فارس، الٰہیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، نگارستان فارس اور جانورستان۔ لیکن جو مقبولیت اس کی کتاب آبِ حیات کو نصیب ہوئی وہ کسی اور کتاب کی قسمت میں نہ تھی۔ جب یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تو ہندوستان کے تمام اخبارات ورسائل نے اس پر نہایت شاندار تبصرے لکھے۔ اس بے پناہ مقبولیت کو دیکھ کر آزاد بے حد مسرور ہوئے اور انھی دنوں اخبارات کو ایک مضمون لکھ بھیجا، جس میں کہا:

"میری عمر کا بڑا حصّہ سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ یہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسبِ حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پہلے لکھنا اور پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا؛ لکھنا اور مٹانا؛ بوڑھا ہو کر بچہ بننا۔ چلتے، پھرتے، سوتے جاگتے بچوں ہی کے خیالات میں غرق رہنا۔ توبہ ہی بھلی۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے تب کہیں وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ خیر میرے پیارے اہلِ وطن تُمھاری خدمت نہ کی تُمھارے بچوں کی خدمت کی۔ لیکن اے کاش! میری عمر کے وہ دن جب شباب کی بہار تھی، طبیعت جوان تھی۔ جوش ٹپکتے تھے،

مضامین برستے تھے اور رنگ اُڑتے تھے۔ان تصانیف میں خرچ ہوتے تب
میرے دل کے ارمان نکلتے۔ملک کی اصلاح واصلاح [کذا] ہوتی۔تُمھاری
نظر سے گزرتے۔تُم خوش ہوتے، میں خوش ہوتا لیکن بندگی بے چارگی، آخر
نوکر تھا وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔تاہم جو وقت نوکری سے بچتا اس میں آرام نہ کرتا،
بہت کم سوتا۔اپنی معلومات فراہم کرتا اور اس طرح یہ اوراقِ پریشاں جمع
ہے۔اور آبِ حیات کا جام بنا کر تُمھاری ضیافتِ طبع کے لیے پیش کر دیا۔''

اس اقتباس سے آپ نے یہ اندازہ بھی لگالیا ہو گا کہ آزاد کا سمندِ قلم کس
انداز سے خوش خرامیاں کیا کرتا تھا۔بالکل اُن رنگین بادلوں کی طرح جو شملہ کی بھیگی
ہوئی پہاڑیوں پر اُڑے جا رہے ہوں یا اُن مست گیتوں کی طرح جو کسی آبشار سے نکل
کر موجِ نور کی طرح فضا میں پھیل رہے ہوں۔جو کُچھ میں عرض کر رہا ہوں وہ مبالغہ
نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ثبوت درکار ہو تو لیجیے حاضر ہے۔

آزاد نے آبِ حیات میں شاعروں کے پانچ دور بنائے۔پہلے دور میں
ابتدائی شعرا یعنی ولی، مضمون اور ناجی وغیرہ کا تذکرہ ہے۔اس دور کا آغاز یوں کرتے
ہیں:

''نظمِ اُردو کے عالم کا نوروز ہے۔نفسِ ناطقہ کی روح۔یعنی شاعری عالمِ وجود
میں آئی تھی مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ولی نے آکر ایسی میٹھی آواز سے
غزل خوانی کی کہ اس بچے نے انگڑائی لے کر کروٹ لی۔''

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''وہ دیکھو مشاعرہ کی محفل جمی ہوئی ہے۔معقول معقول بڈھے اور جوان برابر

لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں کوئی کٹاری باندھے ہے کوئی سیف لگائے ہے۔ بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے، بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رُخصت کیا تھا اب کیوں کر رکھیں ___ کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ اُن کی بڑھاپے کی زندہ دلی سے نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوئی جاتی ہے۔''

اُردو کے پہلے شاعر وَلی کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ نظمِ اُردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورہ نے اپنے جواہرات خرچ کیے اور مضامین کی دستکاری سے مینا کاری کی گئی۔ جب کشورِ وجود میں پہنچا تو ایوانِ مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ شہرتِ عام نے بقائے دوام کا جو محل اُس کے لیے تیار کیا ہے اس کی بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو اور جو کتابے لکھے گئے اُنھیں پڑھو۔ دُنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔''

آزاد کے زمانے میں عشقیہ شاعری نظروں سے گر رہی تھی اور اس کی جگہ فطری، سماجی، اخلاقی اور سیاسی شاعری لے رہی تھی۔ آبِ حیات کے خاتمے میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''ہندوستان کی پُرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی اور اس کی ترقی کا چشمہ بند ہوا۔ اہلِ مشاعرہ نوحہ خوانی کر رہے ہیں کہ اے صدر نشینو تم چلے اور حُسن و

عشق کے چرچے اپنے ساتھ لے چلے۔ کیونکہ متاعِ عشق کے بازار تھے تو تُمھارے دم سے تھے۔ نگارِ حسن کے سنگار تھے تو تُمھارے قلم سے۔ تُمھی قیس و کوہکن کے نام لینے والے تھے اور تُمھی لیلیٰ و مجنوں کے جوبن کو جلوہ دینے والے۔ لیکن اجسامِ فانی کی پرستش کرنے والے کہتے ہیں کہ تُم گئے اور مشاعرے ہو چکے۔ نہیں نہیں تُمھاری تصنیفیں، تالیفیں، حکایتیں اور روایتیں جب تک موجود ہیں تُم آپ موجود ہو۔ تُمھارے فخر کی دستاریں ایسے تحسین و آفرین کے پھولوں سے تاجدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہیں گے اور گلے میں ان سدا بہار پھولوں کے ہار ہیں جن تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہنچے گا۔ تُم میں آواز نہیں مگر رنگا رنگ کی بولیاں بول رہے ہو۔ تُم وہ ہو کہ نہیں ہو مگر ہو، مر گئے ہو مگر پھر بھی زندہ ہو۔ اے کاغذی خانقاہوں کے بسنے والو! تُمھاری تصانیف تُمھارے آباد گھر ہیں۔ جب آنکھیں کھولتا ہوں تُم نقوش و حروف کے لباس پہنے ہنستے بولتے، پھرتے چلتے نظر آتے ہو۔۔۔۔۔''

آزاد کے سینے میں ایک نہایت حسین دل تھا۔ دل نہیں تھا محبت کا ایک چھلکتا ہوا جام تھا۔ اسے اپنے مولد یعنی دہلی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے وہ دہلی کی بربادی پر نظم و نثر دونوں میں اکثر آنسو بہاتا رہا۔ اُسے زبان سے محبت تھی اس لیے اصول زبان منضبط کرنے کے لیے ''قواعدِ اُردو'' لکھی اور زبان بنانے والوں میں شاعروں کو آبِ حیات کا وہ جام پلایا کہ وہ حدودِ زمان و مکان کو توڑ کر لازوال بن گئے۔ آزاد کے آباواجداد ایران سے آئے تھے اس لیے ''سخندانِ فارس'' لکھ کر اپنی آبائی زبان کے دامن میں وہ موتی ٹانکے جن کی چمک کے سامنے زہرہ وعطارد ماند پڑ

جائیں۔اپنے استاد ذوقؔ سے محبت تھی۔اس لیے اُن کا کلام مدون کیا۔ ہندوستان کے دورِ اسلامی پہ ناز تھا اس لیے دربارِ اکبری لکھی اور اپنے خالق یعنی اللہ سے محبت تھی اس لیے جب فلسفیانہ مضامین پر کچھ لکھنا چاہا تو الٰہیات کو منتخب کیا ____ الغرض آزادؔ محبت، شعریت اور علم و فلسفہ کا ایک متحرک پیکر تھا وہ ایک ساحر تھا کہ جہاں قدم رکھتا تھا اس کا ہر نقشِ قدم خیابانِ ارم میں بدل جاتا تھا یا ایک مغنی تھا جس کی ہر سانس موسیقی کی لہر بن جاتی تھی۔ گو وہ طائرِ نوا سنج ۲۲۔ جنوری ۱۹۱۰ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے حیات انگیز نغموں کی گونج بزمِ جہان میں ابھی تک باقی ہے۔

[یہ مضمون پہلے پشاور ریڈیو سے نشر ہوا اور پھر آل انڈیا ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے "آواز" نئی دہلی میں شائع ہوا۔]

☆☆☆

ہندی واُردو کے مقدمے کا فیصلہ

تاریخ کی عدالت میں

ایرین: ہندوستان میں آج سے کئی ہزار سال پہلے ایرین آئے۔ یہ لوگ کہاں سے آئے؟ ان کا اصلی وطن کہاں تھا؟ ابھی تک متحقق نہیں ہو سکا۔ تازہ تحقیق سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ اُس سرزمین سے اُٹھے تھے جس کے مشرق میں کارپیتھنز، مغرب میں آسٹرین الپ، شمال میں از برج اور جنوب میں ممالکِ بلقان واقع ہیں۔

ہجرت: ایرین نے اپنے اصلی وطن کو ناقابلِ برداشت سردی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا۔ پہلے مرو و بخارا میں آئے جہاں سے دشمن اقوام نے انھیں بلخ کی طرف بھگا دیا۔ وہاں سے یہ نیشاپور پہنچے اور کُچھ عرصہ کے بعد ہرات و کابل میں وارد ہوئے۔ ایرین کی ایک شاخ میڈس جنوبی ایران کی طرف سے ایران میں داخل ہوئی لیکن سلطنتِ ارارات (Ararat) سے شکست کھا کر ایران کی مغربی سطح مرتفع کی طرف چلی گئی۔ ایرین کی ایک شاخ ایشائے خورد پر قابض ہو چکی تھی اور ایک شاخ شمالی خراسان سے داخل ہو کر پارس پر مسلط ہو گئی۔ یہی شاخ آہستہ آہستہ ہندوکش کی طرف بڑھی اور پنجاب کی طرف نکل آئی۔

تاریخِ داخلہ: اس ہجرت پر سینکڑوں سال صرف ہوئے۔ اہلِ بابل کے قدیم لٹریچر میں جو ۲۵۵۷ ق م میں مرتب ہوا تھا، ایرین کا ذکر ملتا ہے۔ بکٹریا پر ۲۵۰۰ ق م میں حملہ ہوا۔ ایرین کی ایک شاخ کسائٹس (Kassites) نے ۱۷۰۰ ق م میں

حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ہمیں ۱۲۰۰ ق م کے چند ایسے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن میں دو نام مینڈا (Manda) اور ہٹائٹ (Hittite) ملتے ہیں یہ غالباً ایرین کی دو شاخوں کے نام تھے۔

تاریخ میں پہلی دفعہ یہ لوگ امیڈے (Amidai) اور میڈے (Madai) کے نام سے ظاہر ہوئے۔ شلمینسر سوم (Shalmanser III) نے ۸۵۹ ق م میں اس قوم کو متحد کر کے کئی ممالک کو زیرِ نگیں کیا۔

زبان: ایرین کی اصلی زبان کیا تھی؟ اس کا حتمی جواب مشکل ہے لیکن کشفیاتِ تازہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ اپنے وطن میں ایک خاص زبان بولتے تھے۔ جب ان لوگوں نے مختلف ممالک پر قبضہ کیا تو وہاں کی زبانوں کے اثر سے مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں۔ ہندوستان میں سنسکرت، ایران میں پرانی فارسی اور یونان میں یونانی بنی۔ اسی طرح بابلی، آرمینی، البانی، جرمینک، سلِٹک، اٹالیک اور المائٹ اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ زبانیں مختلف رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ بابلی زبان کے کئی سو رسم الخط، امائٹ کے ۱۱۳ اور قدیم فارسی کے ۴۱ رسم الخط تھے۔

ایرین ہند میں: ایرین ہند میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو شودر و ملیش سمجھ کر انھیں سنسکرت بولنے اور لکھنے سے محروم کر دیا۔ لیکن ضروریاتِ زندگی کی وجہ سے برہمن ملکی زبان بولنے پر مجبور ہو گئے۔ زبان پر اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت جمود وسکتہ کی حالت تک پہنچ گئی اور بدھ مت کے عروج نے سنسکرت کو درس گاہوں تک سے نکال دیا۔

یونانی تہذیب: کچھ عرصے کے بعد سکندر یہاں آیا۔ نئے قسم کے آلاتِ جنگ، فلسفیانہ و معاشری خیالات ساتھ لایا۔ تجارت کی نئی راہیں کھلیں۔ نئی اشیا کے نئے نام زبان میں داخل ہو گئے۔ یونانی تمدن کا خاصہ اثر پڑا لیکن کوئی زبردست ذہنی، لسانی یا علمی انقلاب رونما نہ ہوا۔

پیمبرِ اسلام کا زمانہ: پیمبرِ اسلام کے زمانہ میں تقریباً بیس زبانیں ہندوستان میں بولی جاتی تھیں جن میں سے چند اہم یہ تھیں:

(ا) پالی: جو صوبہٗ بہار کی زبان تھی۔

(ب) جینا پراکرت: یہ جین مت کی مقدس زبان تھی۔

(ج) مہاراشٹری: مہاراشٹر کی زبان۔

(د) سوراسینی: برج یعنی متھرا کے گردونواح کی زبان۔

(ہ) ماگدھی: جو صوبہٗ بہار کے ایک حصّے میں بولی جاتی تھی۔

ان تمام زبانوں میں سے سوراسینی (جس کا دوسرا نام بعض تذکرہ نگاروں نے برج بھاشا رکھا ہے) بہت اہم تھی۔ جو بہار سے سندھ تک اور لاہور سے مالوہ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہی وہ زبان ہے جس پر اسلامی زبانوں یعنی عربی و فارسی کا بہت زیادہ اثر پڑا۔

اسلامی حملوں کی ابتدا: ہندوستان کے عام تعلیم یافتہ لوگ صرف محمد بن قاسم کے حملے سے آگاہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم سے تقریباً ستر سال پہلے ہندوستان پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ ۱۵ھ میں عمان و بحرین کے گورنر عثمان بن عاص

الثقفی نے سندھ پر پہلا حملہ کیا؛ چند ماہ بعد دبیل ومغیرہ نے دوسرا حملہ کیا۔۴۴ھ میں امیر مہلب بن صفرہ نے پنجاب پر تیسرا حملہ کیا اور محمد بن قاسم نے ۸۶ھ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان (امیہ) کے حکم سے سندھ پر چوتھا حملہ کیا اور یہاں ایک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو ۱۴۷سال (۲۳۳ھ تک) باقی رہی۔اس کے بعد ۳۲۴ھ میں ایک سامانی غلام الپتگین نے غزنی میں ایک حکومت قائم کر لی۔جس کا جانشین سبکتگین بنا، سبکتگین نے جے پال کو دو دفعہ شکست دی۔ سبکتگین کے بعد محمود فرمانروائے غزنی بنا اور ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۴ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔۱۱۵۳ھ میں غزنی کے ایک بادشاہ بہرام شاہ نے لاہور کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔۱۱۶۰ء میں شہاب الدین غوری نے غزنوی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور خود ہندوستان کے ایک وسیع خطے پر حکومت کرنے لگا۔۱۲۹۶ء سے خلجیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔۱۳۴۵ء میں بہمنی خاندان کی حکومت شروع ہوئی جو ۲۰۰ سال تک جاری رہی۔

ان حملوں کا نتیجہ: سندھ اور ملتان کم وبیش پانچ سو سال تک خالص عرب حکومت کے زیرِ نگیں رہے۔عراق اور عرب کے بہت سے قبائل یہاں آکر آباد ہو گئے۔حاکم و محکوم کی زبانوں کے اختلاط سے سندھ میں ایک نئی زبان پیدا ہوگئی جسے آج ہم سندھی زبان کہتے ہیں۔اس زبان میں سینکڑوں عربی الفاظ اصلی یا کچھ بگڑی ہوئی صورت میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔

غزنوی حملوں کے ہمراہ ایران کے کئی خاندان آئے جو یہیں مقیم ہو گئے اور اپنی زبان، تہذیب و معاشرت سے اہلِ ہند کو متاثر کرنے لگے۔ابنِ بطوطہ جو

۷۳۴ھ (۱۳۳۴ء) میں یہاں آیا تھا، اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کا وسیع ملک ۱۳۳۴ء ہی میں اسلامی تہذیب سے بڑی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔

اسلامی تہذیب مصر، عراق، ایران اور چند دیگر ممالک پر کاملاً چھا چکی تھی لیکن ہندوستان کے لوگ اپنی پُرانی تہذیب کو جلدی جلدی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے نیتجتاً ہر دو تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ مسلمان اپنے ساتھ ایک نئی زبان کے علاوہ چند نئی چیزیں بھی لائے تھے مثلاً نیا لباس۔ یہاں کے لوگ سادگی کی وجہ سے عموماً ایک دھوتی یا کپڑے میں گزارا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ سنسکرت میں قمیص، پاجامہ، قبا، شیروانی و دستار کے لیے کوئی لفظ موجود نہ تھا۔ ان کپڑوں کے نام مجبوراً مسلمانوں سے لینا پڑے۔ اسی طرح مکانات کے سلسلے میں دالان، چبوترہ، حمام، محل، حرم سرا، زنان خانہ وغیرہ ہندوستان کے لیے نئی چیزیں تھیں۔ خوراک کے سلسلے میں اہلِ ہند کچی سبزیوں یا دالوں پر گزارا کر لیتے تھے۔ وہ روٹی، نان، پلاؤ، قورما، کباب، متنجن، بریانی وغیرہ سے ناواقف تھے۔ دوسری طرف مدارس، عدالتیں، استغاثے، وکیل، منشی، منصف، شاعر، سرہنگ، صوبہ دار، عامل اور بیسیوں دیگر محکمے عہدے و پیشے بروئے کار آئے اور اس طرح سینکڑوں نئے الفاظ ہندوستانی بولی میں شامل ہو گئے۔ فارسی شعرا نے فارسی اوزان، قافیے، بحر و استعارے ملک میں جاری کیے۔ بادشاہوں و عہدے داروں سے متاثر ہو کر ہندوستانی اُمرا نے ایرانی لباس زیبِ تن کیا اور جس طرح آج ہم انگریزی میں گفتگو کرنا باعثِ فخر اور اُردو بولنا باعثِ ہتک سمجھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بڑے فخر سے شاہی زبان یعنی فارسی بولنے لگے۔ ایرانی فرماں رواؤں نے کچھ تو ازراہِ محبت اور کچھ

ضروریاتِ زندگی سے مجبور ہو کر ہزارہا ہندی الفاظ کو اپنی زبان میں جگہ دی۔ اس طرح فارسی و ہندی کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے اُردو کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ہر دو زبانیں ایرین زبانیں تھیں جن میں تقریباً بہن بہن کا رشتہ تھا اور ہندی و ایرانی نسلیں بھی ایرین نسلیں تھیں۔ یہ دونوں بہنیں ہزارہا سال کے بعد یوں ملیں کہ ایک دوسرے کی صورت تک سے ناآشنا تھیں۔

ابتدائی اُردو کے چند نمونے: جب یہ دونوں زبانیں آپس میں مل رہی تھیں تو نامحسوس طور پر ایک تیسری زبان پیدا ہو رہی تھی۔ اس تیسری زبان کی ابتدا میں شکل و صورت کیا تھی۔ نمونہ ہائے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

(الف) شیخ فریدالدین گنج شکر (موت ۱۲۷۰ء) سے ایک آدمی نے پوچھا: "عقل کجا می ماند" تو جواب ملا کہ "بیچ سر کے"۔

(ب) دکن کے ایک بزرگ خواجہ بندہ نواز سیّد محمد گیسو دراز (وفات ۱۴۲۲ء) کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو: "بھوکوں مُوئے سوں خدا کُچھ اپڑیتا ہے۔" خدا کو اپڑنے کی استعداد ہوا ہے۔

(ج) قطب عالم احمد آبادی (وفات: ۱۴۵۳ء) کو راہ چلتے کہیں ٹھوکر آ [لگ] گئی تو پوچھا: "لوہا ہے یا لکڑ ہے یا پتھر۔"

(د) شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی (وفات: ۱۵۹۰ء) کے تمام اقوال ایک کتاب بحر الحقائق میں جمع کر دیئے گئے ہیں، مذکور ہے:

۱۔ "کسے گفت کی شیخ فضل اللہ ترکِ درس کردند، فرمودند جب ترقی پکڑیں گے تب آپیں درس کہیں گے۔"

۲۔ "شخصے پرسید عارف کرا گویند، فرمودند جو خدا سوں بھریا ہووے۔"

(ہ) سیّد ہاشم شاہ علوی گجراتی (وفات: ۱۶۲۶ء) شعر بھی کہا کرتے تھے، فرماتے ہیں:

ہاشم جی کی سُنیئے بات

جس نے رکھی باسی بھات

اس کا جاوے ہاتھے ہات

(و) اُسی زمانے کے ایک شاعر مُلا قطبیؔ (وفات: ۱۶۳۷ء) نے فارسی کی ایک کتاب تحفۃ النصائح کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں:

بولوں صفت میں بے گنت

اُس خالقِ جن و بشر

نردھار کر اسمان رکھیا

سورج ، ستارے ہور چندر

(ز) اورنگ زیب عالم گیرؒ کے احکام عموماً فارسی میں ہوا کرتے تھے لیکن گاہے گاہے ہندی میں بھی حکم جاری کر دیا کرتا تھا اور ایک خط جو شاہ جہان کو لکھا تھا؛ اس امر کا ذکر بھی کیا ہے:

"آں فرمانِ عالی کہ درزبانِ ہندی از دستخطِ خاصی رقم فرمودہ، شاہدِ این معانی است۔"

(ح) امیر خسرو (وفات: ۱۳۲۵ء) جو آج سے ۶۱۶ سال پہلے گزرے ہیں، بڑی کامیابی کے ساتھ ہندوستان کی نئی زبان میں دوہرے، دوسُخنے اور ڈھکوسلے کہا کرتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

اماں میرے باوا کو بھیجو جی ۔۔۔ کہ ساون آیا

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری ۔۔۔ " " "

اماں میرے بھائی کو بھیجوری // // //

بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری // // //

اماں میرے ماموں کو بھیجوری // // //

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری // // //

ان نمونوں سے یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ اُردو زبان کا ڈھانچا آج سے تقریباً ۶۰۰ سال پہلے تیار ہو چکا تھا۔ جو لوگ اُردو کو عہدِ شاہ جہان کی پیداوار قرار دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ شاہ جہان کی وفات ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں ہوئی اور امیر خسرو ۳۳۴ سال پہلے گزر چکا تھا۔ اسی طرح گولکنڈہ کا مشہور فرماں روا سُلطان قطب قلی شاہ شاہ جہان کی پیدائش سے پندرہ سال پہلے فوت ہو چکا تھا لیکن اس کی ۱۸۰۰ صفحات کی کلیات جس میں پچاس ہزار شعر ہیں، حیدر آباد دکن کی شاہی لائبریری میں موجود ہے۔

الغرض ہندی و ایرانی زبان کے ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی جو ہندو مسلم اتحاد کی بہترین یادگار ہے۔ جو لوگ اُردو کو خالص اسلامی زبان کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ فارسی و سنسکرت ہر دو ایرین زبانیں ہیں جن کے ملاپ سے اُردو پیدا ہوئی۔ اس لیے اُردو کو بھی آریائی نسل کی زبان سمجھنا چاہیے اور ہم آریہ نسل کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس زبان کی بے وجہ مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔

ملاپ کا مزید ثبوت: میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اُردو دراصل ایرانی و ہندی کے اختلاط کا نام ہے۔ ہمیں اُردو میں بعض ایسے مرکبات یا الفاظ کے جوڑے ملتے ہیں جو خالص ہندی ہیں مثلاً: بھائی بند، گھر بار، مار پیٹ، ریل پیل، دھان پان۔ دن دہاڑے، پکڑ دھکڑ، بھاری بھرکم، لاڈ پیار، مٹک جھٹک، سادھو سنت، اینٹ پتھر، گالی

گلوچ، سمجھ بوجھ، چال ڈھال، چال چلن، سکھ چین، میل جول، مار دھاڑ، نوک جھونک، راج پاٹ، ٹھوک بجا، بن سنور، نہا دھو، برچھی بھالا، ساگ پات، روکھی سوکھی، ڈھول دھپا، بھول چوک، سنگ ساتھ، چور چکار، کانٹ چھانٹ، توڑ پھوڑ، لگی لپٹی، سوچ بچار، وغیرہ اور بعض ایسے جوڑے ملتے ہیں جن میں ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی ہے مثلاً:

بال بچہ، خیر سلا، خاک ڈھول، وغیرہ۔

اُردو کی تربیت میں بعض دیگر زبانوں کا حصّہ: اُردو میں بعض دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہو چکے ہیں مثلاً

(۱) تُرکی زبان کے الفاظ: آکا، قرق، چق، کتا۔

(۲) کمرہ (اطالوی) نیلام (پرتگالی) پادری (لاطینی) بوتام (فرانسیسی)

(۳) انگریزی زبان کے الفاظ: کوٹ، واسکٹ، بٹن، ہیٹ، ٹائی، کالر، پاکٹ، بوٹ، رسٹ واچ، موٹر، لاری، بائیسکل، ریل، سٹیشن، سگنل، لائن کلیئر، انجن، بریک، ٹکٹ، کارڈ، پلیٹ فارم، گارڈ، ڈرائیور، وِسّل؛ وغیرہ وغیرہ جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

کوئی زبان اِس ''گداگری'' کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ انگریزی میں جو دُنیا کی بہت ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے، لاطینی، یونانی، فرانسیسی و دیگر زبانوں کے ہزار ہا الفاظ پائے جاتے ہیں۔ بعض الفاظ فارسی کا بگاڑ ہیں۔

جب عربوں نے ہسپانیہ میں حکومت قائم کر لی اور ان کے تجارتی تعلقات انگلستان سے قائم ہو گئے تو سینکڑوں عربی کے الفاظ انگریزی نے مستعار لیے۔ گو عربی

ایک سامی زبان ہے اور انگریزی آریائی زبان، پھر بھی انگریزی کو عربی سے چند الفاظ لینے میں کوئی عار نہ آئی، حیرت ہے کہ ہمارے بعض ہندوستانی سیاستدان اُردو کو اس لیے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں کہ اس میں فارسی کے الفاظ کیوں پائے جاتے ہیں۔ انگریزی کے مندرجہ ذیل الفاظ عربی کا بگاڑ معلوم ہوتے ہیں:

۱۔صوت	Sound	۲۔جرم	Crime
۳۔طال	Tall	۴۔قابل	Capable/Able
۵۔عنبر	Amber	۶۔معدن	Mine
۷۔مراۃ	Mirror	۸۔فتق	Pistatio
۹۔رز	Rice	۱۰۔زعفران	Saffron
۱۱۔شُرب	Syrup	۱۲۔جمل	Camel
۱۳۔کیمیا	Alchemy	۱۴۔الکحل	Alcohal
۱۵۔ الجبرا	Algebra	۱۶۔قیراط	Carat
۱۷۔درجہ	Degree	۱۸۔درہم	Dram
۱۹۔ مقناطیس	Magnet	۲۰۔فلسفہ	Philosophy
۲۱۔منارہ	Minaret	۲۲۔طریق	Track
۲۳۔قُطن	Cotton	۲۴۔حاضر	Hoof
۲۵۔قتل	Kill	۲۶۔مستور	Mysterious
۲۷۔عنق	Neck	۲۸۔ثعبان	Serpent
۲۹۔ غرق	Wreek	۳۰۔اصطبل	Stable

۳۱۔ خلیفہ	Caliph	۳۲۔مسجد	Mosque
۳۳۔حلیف	Ally	۳۴۔قصر	Castle
۳۵۔قندیل	Candle	۳۶۔قضیہ	Cause
۳۷۔ارض	Earth	۳۸۔فورۃ	Fury
۳۹۔علیل	ILL	۴۰۔تہدید	Threat
۴۱۔رفض	Refuse		

اُردو کی موجودہ حیثیت: یوں تو آج ہندوستان میں تقریباً ۳۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اُردو کے بغیر باقی تمام زبانیں محض مقامی حیثیت رکھتی ہیں جو زبان ملک کے طول وعرض میں سمجھی جاتی ہے، جس کا لٹریچر بہت شاندار ہے اور جس کی شاعری ارتقا کے تمام مدارج کو طے کرنے کے بعد آج تقریباً کامل ہو چکی ہے وہ اُردو ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہندی محض ایک کتابی زبان ہے۔ جو بعض مذہبی اداروں کے رسائل واخبارات میں نمودار ہوتی ہے۔ اس پر سنسکرت کے الفاظ کے کئی غلاف چڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور پنجابی تو خیر صوبہ جاتِ متوسط میں بھی کوئی نہیں سمجھتا۔ پنجاب کا ایک ان پڑھ آدمی بھی طالب العلم، مرد، عورت، خبر، لیکچر اور اس قسم کے باقی سادہ سادہ الفاظ کے معانی جانتا ہے اور اگر ہم طالب العلم کو ودیارتھی، مرد کو پُرش، عورت کو ناری، خبر کو سماچار، لیکچر کو واکھیان، معانی کو کشما، صرف کو کیول، لیکن کو پرنتو، لڑائی کو یُدھ، جرنیل کو سیناپتی، صدر کو سبھاپتی شریمان، شری جت، سیکرٹری کو منتری، کانگریس کو راشٹریہ مہاسبھا، کتاب کو پُستک اور حکم کو گھوشنا

سے بدل دیں تو ظاہر ہے، بہت کم لوگ ایسی زبان کو سمجھ سکیں گے۔

رسم الخط کا جھگڑا: ۱۸۸۱ء سے پہلے ہندوستان کے تمام دفاتر میں اُردو رسم الخط رائج تھا۔ لیکن ۱۸۸۱ء میں ایک سرکلر کی رُو سے سی۔ پی میں ناگری اور بہار میں کیتھی رسم الخط جاری کر دیا گیا اور ۱۹۰۰ء میں لفٹنٹ گورنر میکڈانلڈ نے یو۔ پی میں ناگری رسم الخط جاری کر کے اُردو ہندی کے جھگڑے کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ورنہ ہر صاحبِ خرد اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اُردو رسم الخط مین کئی فائدے ہیں، سیکھنے میں آسان، پڑھنے میں سہولت۔ کاغذ اور وقت کی بچت۔ بدیگر الفاظ یہ رسم الخط ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے جو مطالب انگریزی یا ہندی کی چار سطروں میں ادا ہوتے ہیں وہ اُردو کی ایک سطر میں سما جاتے ہیں۔

خاتمہ: ان تمام معروضات کا ماحصل یہ ہے کہ اُردو ہندوستان کی دو قوموں کے اتحاد کی ایک زندہ زبان تیار ہو چکی ہے جس میں ہندی کا لوچ، فارسی کی روانی، عربی کا شان و شکوہ موجود ہے۔ اگر اس عظیم الشان تعمیر کو منہدم کرنے کی کوشش کی گئی تو ساتھ ہی ہندوستان کے اتحاد کا ایک سر بہ فلک محل دھڑام سے زمیں پر آ رہے گا۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ دُنیا کی کوئی زبان نہ تو قرادادوں، تقریروں اور جلوس نکالنے سے بن سکتی ہے اور نہ کسی جوان زبان کے تند دھارے کو کیچڑ یا پتھر پھینک کر روکا جا سکتا ہے۔ زمانے، تہذیب اور زبان کی رفتار کو روکنا افراد کے بس میں نہیں۔ اُردو پوری رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا ادب جوان ہو رہا ہے اور آہستہ آہستہ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں آ رہی ہے۔ ہم ہندوستانیوں کو اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے پودے کی

بار آوری پر آج خوش ہونا چاہیے۔ آریہ نسل کا ہندستانی ایک آریہ نسل کی زبان پر محض اس لیے ناراض ہو کہ اس میں چند فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں ایک ایسی منطق ہے جسے عقلِ عامہ کبھی سمجھ نہ سکے گی۔

[مطبوعہ: سہ ماہی مجلّہ مشعل، گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) بابت مارچ ۱۹۴۲ء]

☆☆☆

ایرانی ادب میں طنز، ظرافت اور بذلہ سنجی

ایرانی ادب میں ظرافت کا عنصر ابتدا سے موجود ہے۔ کلیلہ ودمنہ جیسی قدیم کتاب میں بھی جو نوشیروان کے زمانے میں ہندوستان سے ایران میں پہنچی تھی، کہیں نہ کہیں رنگِ ظرافت پایا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی جیسا مجذوب شاعر واعظوں اور زاہدوں پر نہایت دلچسپ پھبتیاں کستا ہے۔ ایک مقام پر کہتا ہے:

واعظ بہ طنز گفت حرام است مے مخور!
گفتم کہ چشم و گوش بہ ہر خر نمے کنم

عمر خیام، امیر خسرو، عنصری، انوری، سلمان ساوجی، مولانا رومی اور دیگر شعرا کے کلام میں ظرافت کا عنصر کافی ملتا ہے، چناں چہ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(ا) سُلطان محمود غزنوی پولو کھیلتے کھیلتے گھوڑے پر سے گر پڑا، عنصری وہاں موجود تھا، فوراً بول اٹھا:

شاہا ادبے کُن فلکِ بد خو را
کافت رسانید رُخِ نیکو را
گر گوئے غلط رفت بہ چوگانش زن
ور اسپ خطا کرد بمن بخش او را

چند روز کے بعد اسی حادثے کا ذکر چل پڑا اور بادشاہ نے اُس گھوڑے کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو عنصری نے گھوڑے کی طرف سے یوں معذرت کی:

رفتم بر اسپ تا بجرم اش بکشم
گفتا بشنو نخست ایں عذر خوشم

نَے گاوِ زمینم کہ جہاں برگیرم
نَے چرخِ چہارمم کہ خورشید کشم

(۲) ایک دفعہ جہانگیر نے نورجہاں کے سامنے یہ مصرع پڑھا:

ع چرا خم گشتہ می گردند پیرانِ جہاں دیدہ

تو نورجہاں نے فوراً کہا:

ع بزیرِ خاک مے جویند ایامِ جوانی را

(۳) عمر خیام بغل میں شراب کی بوتل دبائے جارہے تھے کہ ٹھوکر لگی، خود گر گئے اور بوتل ٹوٹ گئی۔ اس پر برافروختہ ہو کر کہنے لگے:

ابریقِ مئے مرا شکستی ربی
برمن درِ عیش را بہ بستی ربی
بر خاک بریختی مئے لعل مرا
خاکم بدہم مگر تو مستی ربی

(۴) امیر خسرو کے ہاں ضیافت تھی۔ ضیافت کے بعد باقی لوگ تو چلے گئے لیکن ایک صاحب دیر تک امیر خسرو کا دماغ چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعہ میں بارہ کا گھنٹا بجا۔ مہمان نے پوچھا "خسرو صاحب! یہ گھنٹا کیا کہہ رہا ہے؟" امیر خسرو نے کہا کہ گھنٹہ کہہ رہا ہے:

نان کہ خوردی خانہ برو، خانہ بر و، خانہ برو
نہ بدستِ تو کردم خانہ گرو، خانہ گرو، خانہ گرو

مہمان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ اُٹھ کر چل دیے۔

(۵) ایک دفعہ امیر خسرو ایک دُھنیے کی دکان کے پاس سے گزرے۔ دُھنیا نہایت انہماک سے روئی دُھن رہا تھا، خسروؔ کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ ساتھی نے پوچھا کیوں صاحب! اس دُھن دُھن کی آواز پر مست ہو گئے؟

خسروؔ "میں کیا کروں لے ہی ایسی ہے" اور فوراً دُھنیے کی دُھن دُھن کے ساتھ یہ شعر پڑھنے شروع کر دیے:

در پئے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت
ایں ہم رفت، آں ہم رفت، ایں ہم، آں ہم، ایں ہم، آں ہم، آں ہم رفت
رفتن دہ، رفتن دہ، دِہ، دِہ رفتن دِہ، رف، رف، رف رف
در پئے جاناں جاں ہم رفت، ایں ہم رفت، آں ہم رفت

(۶) امیر خسرو ایک حجام بچے کو دیکھ کر کہتے ہیں:

حجام پسر بخوبی و رعنائی
دے آئینہ بہ نمود بداں رعنائی
گفتم صنما در برت آیم نایم
فریاد برآورد کہ نائی نائی

(۷) اسی طرح ایک تیلی بچے کے متعلق فرماتے ہیں:

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے
از دست و زبان چرب او واویلے
خامے برخش دیدم و گفتم کہ تِل است
گفتا کہ برو نیست در ایں تِل تیلے

(۸) ابو اسحاق حلوہ کے متعلق کہتے ہیں:

آں من نیم کہ ز حلوا عناں بگردانم
کہ ترکِ صحبتِ شیریں نہ کارِ فرہاد ست

(۹) ایک اور صاحب فرماتے ہیں:

پلاؤ و حلوا چوں بینی شہید کُن خود را
کہ مرگہائے چنیں گاہ گاہ می باشد

(۱۰) جعفر زٹلی اپنی شان میں کہتے ہیں:

من آن رستمِ وقت روئیں تنم
کہ دہ پاپڑ از مُشتِ خود بشکنم
بپوشم اگر جوشنِ جنگ را
ہزیمت دہم پشۂ لنگ را
بہ یک حملہ بالِ مگس بر کنم
قطارِ دو صد مور برہم زنم
دریں دورِ حاضر کہ رستم منم
بتاشہ بگزر گراں بشکنم
چناں بگسلم رشتۂ خام را
کہ سازم خجل رستم و سام را
اگر برکشم تیغِ تدبیر را
ببرم سرِ شیرِ تصویر را

من آنم اگر اسپ جولاں کنم
چہل خانۂ موش برہم زنم
بنام و نشان جعفرِ دردمند
چوں بانگِ خر آوازۂ من بلند

(۱۱) قاسم کاملی کا تخیّل ملاحظہ فرمایئے:

روزِ ہجر مرا دیدہ بس گہر بار است
شبے کہ ماہ نباشد ستارہ بسیار است

(۱۲) وصال شیرازی اس شعر میں ایک نیا مضمون باندھتے ہیں:

اشکم ز سر گذشت و ہماں سوزشم بجاست
در حیرتم کہ سوختنِ من در آب چیست

(۱۳) کسائی سفید بالوں کے متعلق کہتے ہیں:

دشمنِ زندگیست موئے سفید
روئے دشمن سیاہ باید کرد

(۱۴) امیر خسرو کا خیال ملاحظہ ہو:

می روی و گریہ مے آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

(۱۵) ایک صاحب اپنے معشوق اور چاند میں یوں موازنہ کرتے ہیں:

بمیزانِ نظر حسنِ ترا باہ ماہ سنجیدم
میانِ ایں و آں فرقِ زمین و آسماں دیدم

(۱۶) نظامِ تنفس پر حمید الدین ہندی کا انوکھا خیال ملاحظہ فرمایئے:

از بہرِ قطع کردنِ نخلِ حیاتِ من

چوں آرۂ دو دم نفس اندر کشاکش است

(۱۷) ملا مراد کو مولویوں سے بڑی چڑ تھی۔ شہر کے ایک بڑے مولوی صاحب ملا مراد کے سلام کا جواب عموماً نہیں دیا کرتے تھے ایک دن مُلا صاحب نے مسجد میں سلام دیا اور مولوی صاحب نے سر کو ذرا سا ہلا دیا۔ اس پر مُلا صاحب نے یہ رباعی فوراً لکھ کر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی:

اے مولوی از کبر دماغت گندہ

گاہے کہ کند بر تو سلام ایں بندہ

چنداں حرکت نما کہ از روئے قیاس

معلوم شور کہ مردہ یا زندہ

(۱۸) خواجہ نصیر پر مُلا جلال نے کفر کا فتویٰ لگا دیا تو جواباً خواجہ صاحب نے یہ قطعہ کہا:

مرا ملا جلال از گفت کافر

چراغِ کذب را نبود فروغے

مسلماں گفتمش بہرِ مکافات

کہ نبود جز دروغے را دروغے

(۱۹) شہاب ترشیزی نے ایک مولوی صاحب کو گدھا کہہ دیا۔ اس پر مولوی صاحب سخت برافروختہ ہوئے اور پیغام بھیجا کہ شہاب معافی مانگے، جس پر شہاب نے مندرجہ ذیل شعر میں معافی طلب کی:

ترا خر خواندم و گشتم پشیماں

کہ آں بے چارہ را بدنام کردم

(۲۰) ایران میں اصفہان ایک نہایت پُر رونق اور آباد شہر ہے لیکن اہلِ اصفہان اپنی عیاریوں، دروغ بافیوں اور شرارتوں کی وجہ سے ہمیشہ بدنام رہے ہیں۔ شاہ طہماسپ صفوی اصفہان کے متعلق کہتے ہیں:

اصفہاں جنتے است پُر نعمت

ہر چہ در وے گماں بری شاید

ہمہ چیزش خوش است اِلا آنک

اصفہانی درو نمے باید

(۲۱) ایران میں ایک حکیم تمام آبادی کے لیے خطرۂ جان بنے ہوئے تھے۔ ایک ظریف نے آپ کے متعلق یہ قطعہ کہا:

ملک الموت رفت پیشِ خدا

گفت سُبحان ربی الاعلیٰ

یک طبیب است احمق الحکما

من یکے می کُشم و اُو صد را

یا بفرما کہ روحِ او گیرم

یا مرا کارِ دیگرے فرما

(۲۲) وحشی بافقی نے ایک شراب نوش سے قدرے شراب طلب کی۔ اس نے بیچ میں پانی ملا دیا، تو کہا:

بر درِ خانہ قدح نوشے
رفتم و کردم التماسِ شراب
شیشۂ لطف کرد اما بود
چوں حروفِ شراب نیمے آب

(۲۳) انوریؔ زندگی کے مصائب سے تنگ آ کر کہتا ہے:

ہر بلائے کز آسماں آید
گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بزمیں نارسیدہ می پُرسد
خانۂ انوری کُجا باشد

(۲۴) سلمان ساوجی ہر روز شراب سے توبہ کرتا ہے۔ بار بار اس توبہ کو توڑتا ہے:

از بس کہ شکستم و بہ بستم توبہ
فریاد ہمی کند ز دستم توبہ
دیروز بتوبۂ شکستم ساغر
امروز بساغرے بشکستم توبہ

(۲۵) بعض علمائے اسلام کا خیال یہ ہے کہ یزید پر لعنت بھیجنا درست نہیں۔ اس پر جنابِ فنائیؔ کا خیال ملاحظہ ہو:

اے کہ گفتی بر یزید و آلِ آں لعنت مکن
زانکہ شاید حق تعالیٰ کردہ باشد رحمتش
آنچہ با آلِ نبی او کردہ گر بخشد خدا

ہم ببخشاید ترا گر کردہ باشی لعنتش

(۲۶) منصور شیرازی کا دل گم ہوگیا۔ چور کا سراغ یوں لگاتے ہیں:

در سینہ دلم گم شدہ تہمت بہ کہ بندم

غیر از تو کسے راہ دریں سینہ ندارد

(۲۷) ایک صاحب محبوب کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بگورے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردے

دلِ بلبل شکستی غنچہ را دل خستہ آوردے

ز بہرِ زیبِ دستت ماہِ من گلدستہ آوردم

بہ خوبی لاف می زد گل بہ پیشت بستہ آوردم

(۲۸) مولانا رومی مثنوی میں ایک عورت کا قصہ درج کرتے ہیں کہ ہر روز ہانڈی کو بھونتے وقت گوشت خود کھا جاتی تھی اور خالی شوربا خاوند کے آگے لا رکھتی۔ نیز کہتی کہ گوشت بلی کھا گئی تھی۔ ایک دن ایک سیر گوشت آیا، خاوند نے بلی کو پہلے ہی پکڑ کر پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ حسبِ دستور جب رات کو رکابی میں پھر شوربا سامنے آیا اور بیوی نے پھر وہی عذر پیش کیا۔ تو خاوند نے بلی کو پکڑ کر تولا وہ وزن میں صرف ایک سیر نکلی۔ گوشت بھی ایک سیر تھا؛ وہ کہنے لگا:

اگر ایں گربہ است گوشت کجاست

وگر ایں گوشت است گربہ چہ جاست

[مطبوعہ در ادبِ لطیف (سال نامہ): لاہور؛ بابت ۱۹۴۱ء]

☆☆☆

انگریزی ادب کا اثر ناول اور افسانے پر

برگساں کے نزدیک زندگی ایک بے پناہ حرکت کا نام ہے۔ جس کی کوئی منزل نہیں یا ایک تُند رو سیلاب ہے جو اپنی راہ خود بناتا ہے اور علم و ادب کی وادیوں میں سے سرسراتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔

ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی ہر لمحہ نئی کروٹ بدلتی ہے اور ہر کروٹ میں بے شمار انفرادی و اجتماعی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں جنھیں سُلجھانے کے لیے ادب ہمیشہ اہم پارٹ ادا کرتا رہا ہے۔

ناول اور افسانہ کیا ہیں؟ کہانی کا ادبی نام۔ انسان خود ایک کہانی ہے۔ زندگی کا بیتا ہوا ہر لمحہ زمانے کی رفتار کے ساتھ کہانی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ تاریخِ انسانیت شاہد ہے کہ انسان پرانے زمانے میں قصّے کہانیوں میں دل چسپی لیتا رہا۔ تسلسلِ حیات کے ساتھ ساتھ کہانیوں کا لامتناہی سلسلہ بھی ابتدا سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج سے کئی ہزار سال پہلے جن، بھوت، اژدہا، دیو اور پریاں ہماری کہانیوں کا تار و پود تھیں اور آج سوشلزم، مارکسزم، جنسی کش مکش، وفاقِ عالم، جنسی برتری اور شعور و لاشعور ہمارے افسانوں کا موضوع ہیں۔ افسانہ نگاری کی تاریخ کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے ہماری نظر اُس دور پر پڑتی ہے جب انسان اپنے آپ کو مجبورِ محض سمجھ کر فطرت کی ہر مہیب طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا تھا۔ الف لیلہ اُسی دور کی ایک یادگار ہے۔ اس کے بعد اجداد پرستی کا زمانہ آیا۔ عرب، ہندوستان، یونان اور روما

کی کہانیاں اپنے بزرگوں کے بہادرانہ کارناموں سے پُر ہیں۔ان کہانیوں کا مرکزی خیال خیر وشر کا تصادم ہے۔یہی وہ زمانہ ہے، جہاں انسان کو اپنی برتری کا مبہم سا احساس ہونے لگتا ہے۔اس دور کے افسانوں میں فکری اعتدال مفقود ہے۔کہیں تو مافوق الفطرت طاقتوں کے سامنے بے پناہ بے چارگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کہیں برتریِ آدم کا نعرہ اس زور سے لگایا جاتا ہے کہ ساری کائنات کانپ اُٹھتی ہے افسانوی ارتقا کے تیسرے دور میں بادشاہ اور اُس کی ملکہ بہ طور کردار استعمال ہوتے ہیں۔زندگی کی عکاسی شاہی درباروں کی منظر کشی تک محدود ہو جاتی ہے۔یا بہ الفاظِ دیگر شاہ و ملکہ پیش منظر میں آجاتے اور رعیّت پس منظر میں چلی جاتی ہے۔اِس دور کی بہترین مثالیں گلستان اور کلیلہ و دمنہ ہیں۔ہر چند کہ ان کتابوں کی تصنیف میں ہزار سال سے بھی کچھ اوپر کا زمانہ حائل ہے لیکن موضوع، اسلوبِ بیان اور اندازِ فکر میں یہ تیسرے دور کے ادب میں شمار ہوتی ہیں۔کہانی کا چوتھا دور ہمارا اپنا زمانہ ہے۔اس زمانے میں ہمارے ادیب کی توجّہ کا مرکز محل سرا اور دربار نہیں بلکہ افلاس زدہ کسانوں کے جھونپڑے، مزدوروں کی بے نور آنکھیں اور غریبوں کے کُملائے ہوئے چہرے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم افسانہ و ناول پر انگریزی ادب کے اثر سے بحث کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناول اور افسانے کا فرق بھی بتاتے جائیں۔ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ ناول اور افسانہ کی حقیقت ایک ہی ہے۔یعنی محرکات۔فرق صرف اتنا ہے کہ ناول لمبا ہوتا ہے اور افسانہ چھوٹا۔ہر دور کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ناول زندگی کے تمام جزئیات اور جذبات کے نشیب و فراز پر نہایت تفصیل سے بحث کرتا ہے اور افسانے میں زندگی کے کسی ایک واقعے، کسی ایک

جذبے اور کسی ایک کیفیت کی تصویر ہوتی ہے۔ناول میں کردار نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے اور افسانے میں کردار کا تجزیہ ایک غیر متعلق چیز ہے۔ناول مختلف اثرات انسانی قلب و دماغ پر باقی چھوڑتا ہے لیکن افسانہ صرف ایک ہی کیفیت پیدا کرتا ہے جسے تحیّر کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔وہی افسانہ زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جو احساسِ تحیّر میں زیادہ تلخی و شدت پیدا کر سکے۔ناول کئی گھنٹوں کے بعد ختم ہوتا ہے لیکن پڑھنے والا چند لمحوں سے زیادہ نہیں سوچتا برخلاف اس کے ایک مختصر افسانہ چند لمحوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن پڑھنے والا گھنٹوں سوچتا ہے۔افسانے کی یہی وہ ''رمزیت'' ہے جو اُسے زندگی بخشتی ہے۔

اُردو میں کہانی کی ابتدا: اُردو زبان کی سب سے پہلی کتاب ''نشاط العشق'' ہے جس کے مصنف خواجہ گیسو دراز ہیں۔اس کتاب کو ۱۳۰۵ء میں شیخ عین الدین گنج الاسلام نے اُردو میں منتقل کیا تھا اور نسب سے پہلی کہانی فضلی کی ''دہ مجلس'' ہے جو ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی تھی۔۱۷۹۸ء میں محمد عطا خان تحسین نے ''چہار درویش'' تصنیف کی۔اُنیسویں صدی کے پہلے عشرے میں میر امن نے ''باغ و بہار''، میر شیر علی افسوس نے ''باغِ اُردو''، سید حیدر بخش حیدری نے ''قصۂ مہر و ماہ'' اور محمد قادر نے ''قصۂ لیلیٰ مجنوں''، ''آرائشِ محفل اور ''طوطا کہانی'' لکھی۔اس دور کی اہم ترین تصنیف رجب علی بیگ سرور کا ''فسانۂ عجائب'' ہے جس کا سالِ تصنیف ۱۸۲۴ء ہے۔ان کتابوں میں سے اکثر دوسری زبانوں کے تراجم ہیں اور بعض طبع زاد بھی ہیں۔لیکن اسلوبِ نگارش، موضوع اور اندازِ فکر کے لحاظ سے ان میں بہت زیادہ فرق نہیں۔وہی جنوں، دیوؤں اور پریوں کی کہانی کسی سیاح کی زبانی یا با الفاظِ دیگر خیالی کرداروں کے ارد گرد ایک تخئیلی جال اتن دیا گیا ہے۔جسے حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔رتن ناتھ سرشار پہلا

فسانہ گو ہے۔ جس نے زندگی کی تصاویر میں واقعیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی اور جس کی شہرہ آفاق کتاب ''فسانۂ آزاد'' میں قدم قدم پر انگریزی حقیقت نگاری کے نشانات ملتے ہیں۔ ہر چند کہ ''فسانۂ آزاد'' فن کے لحاظ سے ایک مکمل ناول نہیں اور اس کا پلاٹ نیز کردار نگاری بھی بڑی حد تک محلِ نظر ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرشار نے انسانی جذبات کی وہ شاندار تصویر کھینچی اور قدیم لکھنؤ کی معاشرت کا وہ صحیح مرقع پیش کیا ہے کہ کتاب حدودِ زمان و مکان کو توڑ کر لازوال بن چکی ہے۔

غدر کے بعد ہندوستان انگریزی سیاست، تمدن اور افکار کی گرفت میں آ چکا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے حقیقت نگاری بلکہ مقصد نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔

انگریزی کے مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس نے معاشری خرابیوں کے خلاف ناول کی تلوار سے جہاد کیا تھا۔ یہی مولوی نذیر احمد نے استعمال کیا۔ توبۃ النصوح، رویائے صادقہ، بنات النعش اور ابن الوقت، اخلاقِ ناصری کی طرح محض اخلاقی کتابیں تھیں۔ جو پلاٹ کے انوکھے پن کی وجہ سے زیادہ مقبول ہو گئیں ورنہ اگر مولوی نذیر احمد اسی مضمون پر عام واعظانہ رنگ میں لکھتے تو شاید کتب فروش کے بغیر کوئی دوسرا شخص ان کتابوں سے آشنا نہ ہو سکتا۔

عبدالحلیم شرر کی بدولت ناول نگاری کو بہت زیادہ مقبولیت ہوئی۔ شرؔر میں والٹر سکاٹ کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ جس طرح سکاٹ کے بیشتر ناول قرونِ وسطیٰ کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح شرؔر بھی اسلام کے عہدِ زرّیں کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنا کر ان میں رنگِ جاذبیت بھرتے ہیں۔

راشد الخیری نے کم و بیش چالیس اصلاحی کتابیں لکھیں۔ ان میں بیشتر ناول

ہیں۔ راشد کے ناولوں میں کچھ خرابیاں ہیں اور چند نقائص بھی۔ راشد کی عقابی نگاہوں سے ہندوستانی معاشرت کا کوئی پہلو مخفی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ معاشری مسائل پر آپ نے نہایت کامیاب قلم اٹھایا۔ پھر جذباتِ ملال کو عمیق بنانے میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اسی بنا پر دُنیائے ادب نے آپ کو مصورِ غم کے لقب سے نوازا تھا۔ لیکن کردار نگاری میں آپ قدرے غیر محتاط واقع ہوئے تھے۔ آپ کے ناولوں میں ارسطو اور اس کا سائیس علمی و دماغی قُوا کے لحاظ سے ایک ہی سطح کے انسان دکھائے گئے ہیں جو وسعت، بلندی، شستگی اور لطافت ارسطو کی گفتگو میں ہے وہی سائیس کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ بلند و پست کرداروں میں اس غیر فطری ہمواری نے آپ کی تصانیف کو وہ درجہ عطا نہ کیا جو شررؔ اور سرشارؔ کو حاصل ہوا۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد جب فراوانیِ علم اور سہولتِ مواصلات کی بدولت ادب چند آدمیوں کی قید سے نکل کر عوام تک پہنچا تو اس کے مزاج میں بھی اہم تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ لوگوں کی بڑھتی ہوئی مصروفیت اور صنعتی زندگی کی گھما گھمی نے ناولوں کے لیے بہت کم فرصت باقی چھوڑی۔ چنانچہ پہلے طویل افسانے پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ مختصر افسانوں میں بدل گئے۔

یورپ کے افسانوی ادب پر فرائڈ اور مارکس کے معاشی و نفسیاتی نظریے سوار تھے۔ ان کا اثر ہندوستان میں بھی پہنچا۔ لیکن منشی پریم چند اور سدرشن کے بعد۔ پریم اور سدرشن، مارکس اور فرائڈ کے انکشافات سے ناواقف تھے اس لیے ان کے افسانوں میں کہیں بہادر راجپوتوں کے کارناموں کا ذکر ہے اور کہیں بنیئے برہمن اور کسان کا۔ اس دور میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جس نے عقلی ایجادات و

انکشافات سے متاثر ہو کر عالمِ روحانیت و مذہبیت میں عقل ہی کو اپنا رہبر مان لیا۔ اس گروہ کے سب سے بڑے نمایندے نیاز فتح پوری تھے۔ وہ الہام کی رہبری کے منکر تھے اور صرف عقل کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ آپ کی اس بغاوت سے نہ صرف آپ کی مذہبی تحریرات متاثر ہوئیں۔ بلکہ آپ کے افسانوں پر بھی یہی عنصر غالب ہے۔

انگریزی علوم، نظریات اور نئے تمدن کی وجہ سے ہمارا تمام ماحول بدل رہا تھا۔ مذہب، روح، عورت، مرد، مزدور سب کے تصورات اِک نئی صورت اختیار کر رہے تھے۔ قومیت، جغرافیائی حدود توڑ کر بین الاقوامیت کا روپ دھار رہی تھی۔ مزدور و آقا کی کش مکش تمام عالم کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ مارکسی تعلیم کا سیلاب تند قصرِ استعمار کو پیامِ تباہی سُنا رہا تھا۔ فرائڈ و دیگر ماہرینِ نفسیات کے انکشافات نے خیالات و ادب کی پُرانی قدروں کو متزلزل کر دیا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں ہمارے ماڈرن افسانے نے جنم لیا۔ چوں کہ ہمارے افسانہ نگار عموماً انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اس لیے ہمارا جدید افسانوی ادب ہیئت اور فن کے لحاظ سے انگریزی ادب کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ گزشتہ دس سال کے افسانوں پر مارکس اور فرائڈ چھائے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتصادیات اور جنسیات کو زندگی کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔

مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے سے جنسی میلانات اُبھر آئے ہیں اور ضروریاتِ حیات کی کم یابی یا گراں یابی نے کارل مارکس کو زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔ آج جو افسانہ نگار جنسیات پر قلم اٹھاتے ہیں وہ فرائڈ سے متاثر ہیں۔ چاہے وہ شخصی خیالات کی ترجمانی کر رہے ہوں اور جو ادیب معاشی دباؤ سے کراہتے ہیں وہ کارل مارکس سے متاثر ہیں۔

افسانہ نگاروں کی جدید ترین قسم ترقی پسندوں کی ہے۔ جن کی تحریرات

معاشی و غیر سائنسی مذہبی قیود کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ضامن ہیں۔ یہ ایک منظم جماعت ہے اور چوں کہ اس میں لکھنے والوں کی اکثریت اشتراکی خیالات کی حامل ہے اس لیے اس جماعت کو روس پسند اور مادہ پرست سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تمام اصولی اختلاف کے باوجود ہمارے تمام ادیبوں میں آقا و مزدور کی کش مکش پر کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ استعمار اور سرمایہ داری کی ہوس ناکیوں نے ہمارے ادیبوں کو فکری و جذباتی اعتبار سے ایک ایسے سنگم پہ لا کھڑا کیا ہے جہاں پر ایک حیات انگیز و لازوال ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ آج ہمارے ہر ادیب کے قلم سے پاکستان اور ہندوستان کی چیخ نکل رہی ہے اور یہی تنہا نقطۂ وحدت ہے جہاں ترقی پسند و غیر ترقی پسند میں تفریق باقی نہیں رہی۔

ہر چند کہ ہمارے نئے ادب میں نشاطیہ عناصر کی بہت کمی ہے اور اس کی فضا پر مغموم جذبات کی بدلیاں چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارا ادیب کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے من و عن بیان کر دیتا ہے۔ اگر ہمارے عوام کی پیشانیاں مٹی سے لتھڑی ہوئی ہیں اور اُن کی آنکھوں میں مسرت کی چمک کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تو ہمارا ادیب جس کا کام ہی ماحول کی عکاسی ہے اپنی تصاویر میں رنگِ طرب کہاں سے اور کیسے بھرے؟

اس وقت افلاس و نکبت کی تاریک گھٹاؤں میں افق سے بہت دُور چاندی کی ایک لکیر نظر آتی ہے جسے زندگی کی نئی راہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مجھے اُمید ہے کہ دورِ نو کے حیات افروز ماحول میں ہمارا ادب بھی وہی مقامِ بلند حاصل کر سکے گا جس پر انگریزی ادب مدت سے پہنچا ہوا ہے۔

[مطبوعہ در سنگِ میل، پشاور ______ س ن]

ادبیات عامہ (جنرل لٹریچر)

جناب صدر و اہل محفل:

میرا موضوع سخن ادبیات عامہ ہے۔ قبل اس کے کہ میں اصل مطلب کی طرف آؤں اس عنوان کے متعلق اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ عنوان بے حد وسیع ہے۔ مختصر وقت میں اس پر تفصیل تو خیر مجملاً بحث بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ ادبیات عامہ میں انگریزی، اردو عربی، بھاشا، فارسی اور دیگر تمام زبانوں کے لٹریچر شامل ہیں۔

اس امر کو دیکھتے ہوئے کہ میں صرف چار زندہ زبانوں سے واقف ہوں، میرے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ میں ہر چہار زبانوں کے علوم و فنون پر کسی قدر روشنی ڈالوں۔ پھر مجھے آپ کی تکلیف کا تصور اور آرام کا خیال بھی ہے۔ تکلیف اسلیے کہ چار زبانوں کے لٹریچر پر بحث ناممکن ہے۔ آرام اس لیے کہ مجھے پوری آزادی ہے جو کچھ چاہوں کہہ دوں۔ اس عنوان کے ماتحت رہے گا۔

پس حضرات بجائے اس کے کہ ان چار زبانوں کے خشک علوم مثلاً فلسفہ، منطق، ریاضی، سائنس یا تاریخ کے کسی پہلو پر بحث کروں، فنونِ لطیفہ یعنی Light literature جس میں شاعری، خصوصیت سے ممتاز ہے، کے بعض حصوں کو لے کر آپ کے سامنے چند شستہ نادر اور بے نظیر تخیل کے کچھ نمونے پیش کروں۔ امید ہے کہ آپ توجہ دیتے ہوئے محظوظ ہوں گے۔

حضرات! گذشتہ 16 سال سے میں انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور بھاشا لٹریچر کے مطالعہ میں مصروف ہوں جو لطف کہ مجھے ان مختلف علوم کی نیرنگیوں سے آ رہا

ہے۔اس کا اندازہ شاید آپ نہ لگا سکیں۔ میں آج کوشش کروں گا کہ ہر زبان کے بہترین انسان کے چند خیالات آپ کو سامنے پھینکوں۔اور مقابلہ کر کے دکھلاؤں، کہ جدّت اور ندرت کسی زبان کے حصہ میں آئی ہے۔

سہولت کے لیے میں اپنے مضمون کو چند عنوانات میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر کچھ الگ عرض کروں گا۔عنوانات یہ ہیں۔

فطرت، محبت، استدلال وفلسفہ

فطرت:

قبل اس کے میں فطرت کے مفہوم ومصداق پر کچھ عرض کروں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مذکورۃ الصدر زبانوں کا طرزِ بیان ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ اوراس اختلاف کی وجہ ملکی حالات اور سیاسیات ہیں۔انگریزی زبان آزاد دماغوں اور آزادفضا کے اثرات میں جوان ہوئی۔حصہ نظم خصوصاً ان تمام حالات سے الگ رہا۔ جو فارسی، اردو اور عربی پر وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ایشیا کے ان ممالک میں جوان کے مولد ومسکن ہیں۔ بہت عرصہ طوائف الملوکی اور خودمختاریت کا دور دورہ رہا۔امراو سلاطین عیاشیوں کے خوگر ہو گئے ۔گرم آب و ہوا، زمین کی سرسبزیوں اور سہل انگاریوں نے ایسا اثر ڈالا جوان کی ذات سے بڑھ کر اس وقت کے لٹریچر تک جا پہنچا۔ میرے دیدۂ تصور کے سامنے، بغدادی وایرانی دربار ہیں۔ ہزارہا شعرا و مصنفین ان کی گوشۂ عنایت کے منتظر پروانہ وار طواف کر رہے ہیں۔قصائد وتغزل کا طوفان ہے جس کا مقصد بغیر اس کے کچھ نہیں کہ سلطانِ وقت کی شان میں چند پُر مبالغہ اشعار کہہ

کر کچھ انعام حاصل کیا جائے۔ چونکہ عربی کی آخری شاعری، ایران کا تقریباً تمام دور تغزل اور اردو شاعری کا آغاز ان ہی حالات کے ماتحت تھا۔ اس لیے ان ہر سہ زبانوں کی شاعری میں تین چیزیں خصوصیت سے نظر آتی ہیں۔

(۱) مبالغہ، (۲) تکلف (۳) پستیِ تخیل

عرفی، قاآنی، خاقانی، انوری و دیگر ہیچو شعرائے ایران کے کلام میں یہ تین چیزیں نہایت امتیازی شان میں دکھائی دیتی ہیں۔ ممدوح کی تعریف میں وہ وہ مبالغے کیے کہ خدائی شان کسی قدر پست نظر آنے لگی۔ الفاظ میں غیر قدرتی زور، تراکیب میں پیچیدگیاں بندشوں میں ابہام اس دور کی شاعری کا ماحصل ہیں۔ بطورِ نمونہ چند اشعار بمع ترجمہ بیان کر کے اس کی مزید توضیح کروں گا۔

اردو شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب شاہ عالم محمد شاہ رنگیلا، بہادر شاہ ظفر جیسے خوشامد پسند، بے کار محض اور عیاش طلب سلاطین دہلی تخت پر متمکن رہے۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر ناسخ، مومن اور ذوق تک کی شاعری میں پستیِ تخیل تکلف اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ غالب کی شاعری میں بے حد بلندیاں ہیں نہ اس لیے کہ وہ کسی بہتر دور میں پیدا ہوا بلکہ اس لیے کہ اسے کوئی خدا نہ ملا۔ ذوق جیسے ضمیر روشن انسان کی موجودگی میں غالب کی خدمات بے کار ہو گئیں تھیں۔ علاوہ ازیں ناسازگاری حالات سلطنتوں کے انقلابات اور غدر کے واقعات نے غالب کو اتنا متاثر کیا۔ کہ اس کی ہر آواز نوحہ بن گئی۔ اس کا ہر لفظ نغمہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس کی ہر صدا ترنم پا کر نکلی۔ غالب کی شاعری پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زخم خوردہ ہے۔ ملول ہے غمزدہ ہے۔ اس کی شاعری کا مقصد نہ زراندوزی ہے اور نہ کسی مجازی معبود کی خوشنودی مزاج

،وہ روتا ہے اس لیے کہ رونے پر مجبور ہے۔ جلتا ہے اس لیے کہ واقعات ایسے ہیں۔ ذرا ان اشعار پر نگاہ ڈالیے۔ اندازہ لگایئے کہ غالب کا ہر لفظ شرارہ بن کر نکل رہا ہے۔ اس کی آہیں کس طرح آتش بار ہیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
پر توِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

یوں اگر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

غالب کی ہر غزل میں اضطراب وقلق نمایاں پہلو لیے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات میں حیران ہوتا ہوں کہ غالب کے پہلو میں دل تھا۔ یا غموں کا خزانہ، گوشت کا لوتھڑا یا جلتا ہوا انگارہ۔ بہر حال یہ واقعات تھے جن کا لازمی اثر یہ ہوا کہ غالب کی شاعری سوز وگداز میں ڈوب گئی۔ اور دیگر شعرا سے امتیازی رنگ میں نظر آنے لگی۔

حضرات یہ وہ حالات ہیں جن میں سے فارسی، اردو اور کسی حد تک عربی، شاعری ہو کر گذری، اور یہی وجہ ہے کہ ان ہر سہ زبانوں کی شاعری میں آج ڈھونڈے سے بھی کوئی ندرت کوئی شائستگی نہیں ملتی یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ عربی کی ابتدائی دور اور اُردو کی موجودہ شاعری ان تاثرات سے آزاد ہونے کے باعث کسی حد تک خوشگوار رنگ لیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عرب جس آزادی، جس وحشت اور بربریت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سے کون آگاہ نہیں وہاں کے حالات اور ماحول میں جو شاعری جوان ہوئی اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کر رہا ہوں۔ آپ اندازہ لگا سکیں کے کہ اس وقت سوشل حالات کا اثر وہاں کی شاعری پر کیا پڑ رہا تھا۔ اور شاعری کسی قدر آزادیوں اور قدرتی سادگیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ترجمہ:۔

ا۔ میری روتی عورت مجھے عار دلاتی ہے کہ ہمارا قبیلہ تھوڑا ہے حالانکہ شریفوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوا کرتی ہے۔

۲۔ کیا ہمارے لیے یہ فخر کم ہے کہ ہم پڑوسیوں کو عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور اکثر

پڑوسی مناسب دلیل ہوا کرتے ہیں۔

۳۔ہم ایک بلند اور سرسبز پہاڑ کے مالک ہیں۔وہاں وہی اتر سکتے ہیں جو اپنے اعدا سے ہماری پناہ میں آجائیں۔

۴۔ہمارے گھر کا کوئی آدمی چارپائی پر نہیں مرتا۔بلکہ میدانِ جنگ میں اپنے گھرانے، آباؤ اجداد کی عزت و ناموس پر قربان ہو جاتا ہے۔ہم مقتول کا انتقام ضرور لیا کرتے ہیں۔

۵۔ہم شریف باپ کی پیٹھ سے پیدا ہوئے۔ ہماری نسل ساون کی جھڑی کی طرح معطر اور صاف ہے۔

۶۔آباؤ اجداد کی ہمیشہ اس آواز پر قربان ہوئے ''خدا کے لیے بچاؤ ہم گئے''۔

۷۔جب کسی قوم پر مصیبت ٹوٹے تو اس کو بچانے کے لیے ہمارے گھوڑے سب سے آگے نظر آئیں گے۔

۸۔ہم مصیبتوں سے گھبراتے نہیں۔بلکہ اپنی مشکلات کے اندھیروں کو آبدار تلواروں کی چمک سے پھاڑ دیا کرتے ہیں۔

۹۔ہمارا کوئی سردار مر جائے تو ہمارا دودھ پیتا بچہ بھی سردار بننے کی اتنی ہی اہلیت رکھتا ہے، جتنا کہ تجربہ کار جوان۔

۱۰۔ہمارا شیر خوار بچہ جب دودھ چھوڑنے کی حالت کو پہنچے تو بڑے بڑے امرا اور رؤسا قبائل اس کے پاؤں پر سر رکھتے ہیں۔

اس مختصر سی گذارش سے مقصد بتلانا تھا کہ شاعری اپنے ماحول، سیاسی وملکی اور تمدنی حالات سے متاثر ہوا کرتی ہے۔یورپ عموماً آزاد فضاؤں میں پلا۔اس لیے

اس کی شاعری میں صحیح وزن، آزاد دماغی، قدرتی وفطرتی سادگیاں زوروں میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان چونکہ نامعلوم زمانہ سے دیگر اقوام کی جولاں گاہ بنارہا۔اس لیے یہاں کی شاعری میں سادگی، آزادیِ تخیل، ذوقِ صحیح مشکل سے ملے گا۔ جب سے انگریز ہند میں فرمانروا ہوئے ہیں۔ کسی قدر آزادی پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۹ء تک کی شاعری پر اجمالی نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو شاعری عہدِ مغلیہ سے جتنی قریب ہے اتنی ہی پست ہے۔ ۱۹۱۹ء کی ریفارمز اور پریس ایکٹ کی تنسیخ نے ہمارے دماغوں میں نامعلوم طور پر ایک آرزو دوڑادی چنانچہ گذشتہ ۹ سال کا عرصہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ایک روشن ترین زمانہ ہے۔ اکبر واقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۸ء تک کے شاعر ہیں۔ اور خاندان مغلیہ کی آخری دور میں غالبؔ نے جس تخیل کی بنیاد ڈالی تھی اس کی تکمیل اقبال نے کی۔ بالفاظ دیگر غالب اور اقبال مملکت ادب کی دو سرحدیں تھیں گو اقبال اس وقت زندہ ہے۔ لیکن اس کا تخّیل، اس کی زبان ۱۹۱۹ء سے پہلے کے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ غلام دماغوں میں وہ فضا پیدا ہو جائے جو ملٹن، شیلے، کیٹس اور بائرن میں موجود تھی۔

حضرات! چند منٹ پیشتر میں نے وعدہ کیا تھا کہ فطرت نگاری مفہوم کو سمجھانے کے بعد انگریزی واردو شاعری کا مقابلہ کیا جائے گا۔ میں اس وعدہ کو اس تمہید کے بعد پورا کرتا ہوں۔

فطرت نگاری کا مفہوم صرف یہ ہے کہ تخیل قدرتی ہو۔ الفاظ موزوں اور شستہ ہوں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستان مذکورۃ الصدر حالات میں صدہا سال رہ کر سادگی اور قدرتی رنگ سے دور جا پڑا ہے۔ گو ۱۹۰۰ء کے بعد انگریزی تمدن

اور انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر ہماری شاعری کسی حد تک سلجھ گئی۔ ذیل میں چند ایک نمونے پیش کرتا ہوں۔

ایران کا سب سے بڑا جنگی شاعر فردوسی، ہندوستان میں انیس اور یورپ میں Scott تھا۔ میں یہاں تینوں کے اشعار لکھتا ہوں۔ آپ ضرور اندازہ لگائیں گے کہ سادگی، قدرتی حسن کہاں ہے۔ مبالغہ، تکلف، تصنّع اور غیر فطری تخیل کا دلدادہ کون ہے۔

فردوسی:

جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ
زمیں شد محل ستوداں ستوہ
بلند آسمان چوں زمیں شد ز خاک
ز ہر سو ہمی برشدہ چاک چاک
دل کوہ گفتی بدرد ہمی
زمیں با سواران پرد ہمی
زمیں لالہ گوں شد ہوا نیلگوں
ہر آدر ہمی موجِ دریائے خوں

دیکھا حضرات کس قدر مبالغہ اور غیر فطری تکلف ہے۔

اب ذرا ہندی دماغ کی بناوٹ ملاحظہ ہو، "انیس"

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانند کہربا ہوا۔ مٹی کا رنگ زرد

گرمی ہجوم فوج سے دو چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی
اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسمان سے
تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادی بتدر
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا جو اٹھی کربلا میں گرد

دیکھا حضرات زمین و آسمان، کوہ و جبل کو حضرت انیس نے کیوں کر لرزایا۔ اب ذرا انگریزی تخیل ملاحظہ ہو۔ کمانڈر فوج کو میدانِ جنگ میں شکست آمادہ دیکھ کر کیوں کر اُکساتا ہے۔

ترجمہ: میرے بہادر سردارو! مجھے تمہاری شجاعت اور وفاداریِ وطن پر پہاڑ جیسا بھروسہ ہے۔ تمہاری صرف ایک کوشش سے سکاٹ لینڈ آزاد ہو جائے گا۔ اپنی تلواریں اور ڈھالیں لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ نوجوانانِ گریک بڑھو بڑھو بڑھو! دشمن کی صفیں ٹوٹ رہی ہیں۔ Imogail کے بہادر بیٹو! اپنے بچوں بوڑھے ماں باپ، ہمرازِ زندگی کے

ناموس کی خاطر جانیں کٹادو۔ سکاٹ لینڈ کی آزادی اور زندگی تمہاری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ کمانڈار کے ان الفاظ پر ہزاروں نیزے اور چمکدار تلواریں ساون کی جھڑی کی طرح دشمن پر برس پڑیں اور سورج نے تلواروں کی چمک کو دو چند کر دیا۔

حضرات دیکھا آپ نے کس قدر سادگی، بے تکلّفی اور قدرتی الفاظ و خیالات ہیں۔ یہ ہے فطرت نگاری جس سے ہماری مشرقی زبانیں بہت حد تک محروم ہیں۔

حضرات اب میں کوشش کروں گا۔ کہ اُردوئے جدید یعنی ۱۹۰۰ء کی شاعری کے مابعد کے بہترین خیالات انگریزی خیالات کے مقابلہ میں پیش کروں۔

Tennyson یورپ کے زبردست اور بلند پایہ شعراء میں سے ہے۔ آپ نے جوئے آب پر اپنے لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند ایک بہترین اشعار کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

''میں پتھریلے راستوں پر شور مچاتی ہوئی خاموش جھیلوں کے پاس سے گذرتی ہوں۔ میری گہرائیوں میں پتھر چمک رہے ہیں۔ اکثر سورج کی کرنیں نہانے کے لیے۔ میرے کنارے آیا کرتی ہیں۔ میں مرغزاروں سے بل پیچ کھاتے ہوئے جاتی ہوں۔ میرے کناروں پر پھولوں کے پودے مجھ پر پتیاں نچھاور کرتے ہیں۔ میں سرسبز جون کی چاندنی راتوں میں گیت گاتے ہوئے خاموش بستیوں کے پاس سے نکل جاتی ہوں۔ میرے انتظار میں موج دریا آغوش کھولے ہوئے ہیں۔ آدمی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مگر میں چلتی ہی رہوں گی۔''

اب ذرا ہندوستان کے شاعرِ اعظم حضرت اقبال کے خیالات اس موضوع

پر ملاحظہ ہوں:

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ مے رود
مانند کہکشاں بگریبان مرغزار
در خواب ناز بود بہ گہوراۂ سحاب
وا کرد چشمِ شوق بآغوش کہسار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہم بے گانہ مے رود
در راہِ او بہار پر نجانہ آفرید
نرگس دمیدِ و لالہ دمید و سمن دمید
نا آشنائے جلوہ فروشاں سبز پوش
صحرا برید و سینۂ کوہ و کم وزید

دو دنیاؤں کے بلند پایہ شعرا کے خیالات آپ کے سامنے ہیں مقابلہ خود کیجئے۔
"Shelley" نے ایک پہاڑی پرندے (Skylark) کو اڑتے ہوئے دیکھا اور گاتے ہوئے سنا۔ جو جذبات یورپ کے اس مایہ ناز فرزند کے سینہ میں ابھرے ہیں ذرا ملاحظہ فرمایئے:۔

ترجمہ:۔ او لطیف اور خوشنما پرندے۔ تو پرندہ نہیں بلکہ کوئی فردوسی روح ہے جو بہشت یا اس کی حمائیل میں مل کر بے ساختہ ترانے گاتی ہے۔ تو کبھی کبھی شام کے وقت مغرب کے حنائی شفق میں جہاں بکھرے ہوئے بادل کے کچھ ٹکڑے منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ نوزائیدہ مسرت کی طرح اڑ رہا ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کی زرد کرنیں تیری پرواز میں

جذب ہو جاتی ہیں۔ اس ستارے کی طرح جو صبح کے جلووں میں ڈوب جائے تو نظر نہیں آتا لیکن تیری رسیلی آواز سنتا ہوں جس طرح ایک معصوم بچہ پیاری ماں کی محبت سے لبریز مس کو محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح میں تیری پرواز کو دیکھ نہیں سکتا لیکن محسوس کر تا ہوں۔ شام کی خاموشیوں میں تیری بلند آواز یوں گونج جاتی ہے جس طرح کہ کسی خوشگوار رات میں روپہلی چاند کی کرنیں کسی تنہا بادل سے چھن چھن کر برسیں۔ اور دنیا میں روشنیاں ابلنے لگیں۔ تیری مختصر سی ہستی سے نغموں کی وہ مست بارشیں برستی ہیں جو قوسِ قزح کے رنگیں بادلوں سے کبھی نہیں برسیں۔ اس شاعر کی طرح جو خیالات کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہو۔ تو جو لامحدود وسعتوں میں گم ہے۔ یا تو اس محبت کی طرح ہے جو ایک نوجوان اور اداس صحرائی لڑکی کے دیہاتی راگ میں چھپی ہوئی ہو۔ یا اس جگنو کر طرح ہے جو کسی بیابان کی شبنمی وادی میں سبز پتوں اور نرم گھاس کی گود میں نہاں ہو۔

یا اس پھول کر طرح ہے جو پتوں میں چھپا ہوا ہو۔ لیکن اس کی نکہت ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر صحراؤں کی فراخیوں میں پریشان ہو رہی ہو۔

برسات کی ان بوندوں میں جو غنچوں کو جگاتی ہیں۔ اور آم کے پتوں سے موسیقی پیدا کرتی ہیں۔ وہ کیف نہیں جو تیرے اس گیت میں ہے۔ جس سے فردوسی مسرتوں کے طوفان نکل رہے ہیں۔

او چھوٹی سی چڑیا تجھے کس چیز نے اتنا خوش کر رکھا ہے، یہ وسیع میدان، یہ آہستہ خرام موجیں اور سر بہ فلک کہسار، یہ نیلگوں فضا تیری مسرتوں کا منبع ہے۔ یا کہ مصیبتوں سے نا آشنائی؟ تجھ میں محبت ہے لیکن محبت کے لوازمات سے تو غافل ہے۔ مجھے اپنی مسرت کا نصف ہی دے دو، تاکہ میرے منہ سے تیری طرح ایسے نغمے

نکلیں کہ دنیا کو مصائب بھول جائیں۔

موجودہ دور کا ایک ہندوستانی نوجوان شاعر اس مضمون کو لیتا ہے۔ اشعار بعینہٖ درج کر دیتا ہوں۔

تیری صدائے دل نشیں ،مست اور جنوں انگیز ہے
تیری نوائے آتشیں ، فریاد سے لبریز ہے
تڑپا رہی ہے دل مرا ، یہ پر اثر کُو کُو تری
برما رہی ہے دل مرا ، اے مشتِ پر کُو کُو تیری
اس وقت نظروں سے نہاں، تو اپنے کاشانے میں ہے
گونجتی لیکن تری ، آواز ویرانے میں ہے
کیا کشش تھی جو یہاں جنگل میں لے آئی تجھے
جستجو رہتی ہے کس کی ، پیک صحرائی تجھے
تیرا دل بھی درد کی ، دولت سے مالا مال ہے
تجھ کو بھی میری طرح یہ زندگی جنجال ہے
آؤ مل کر اڑ چلیں اس سر زمین پاک میں
جس کی جبیں ضو ریز ہے آئینۂ افلاک میں
خوش نما وادی جہاں دنیا کا کوئی غم نہیں
جس جگہ انسان کو کچھ فکر بیش و کم نہیں

حضرات ،عنوان فطرت نگاری کے تحت ایک دو مثالیں ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد میں محبت اور استدلال پر مختصراً نگاہ ڈالتے ہوئے مضمون ختم کروں گا۔

محبت:

''یہ وہ مسئلہ ہے کہ بقول ایک یورپین فلاسفر، ایک آدمی ہمیشہ ایک ہی محبت کرتا ہے۔ اس محدود وقت میں میں صرف محبت کی مختلف تعریفوں اور بعض دل چسپ پہلوؤں کو شعراء کے نقطہ خیال سے لوں گا۔ محبت کیا ہے اس کو جواب مختلف شعرائے ایران و ہند نے دیا ہے۔ درجہ وار لکھتا ہوں، جواب آخر میں ہوں گے۔

شیفتہ:

عاشقی چیست بگوینده جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن
کہتے ہیں جس کو عشق یہی ہے وہ شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

خیال ایم اے:

ہوشیاری ہے فریبِ عاشقی کھانے کا نام
عاشقی ہے بند آنکھیں کر کے لُٹ جانے کا نام
نامرادی، بے بسی، خواری خدا کی مار، موت
ایک ہو تو کچھ بتائے کوئی دل آنے کا نام

جوش ملیح آبادی:

فروغِ دِل سے باطن کا تجلّی زار ہو جانا
محبت اصل میں ہے روح کا بیدار ہو جانا

حضرت جوش کا یہ تخیّل بے حد کامل پرستش ہے۔ حقیقتاً جس انسان کی زندگی فروغِ محبت سے بے گانہ ہے۔ جس کا دامن حیات خارستان الفت کی الجھنوں سے نا آشنا ہے۔ جس کی حریم دل درد سے معمور نہیں۔ میرے ہاں اسے انسان کہنا انسانیت کو بدنام کرنا ہے۔ حضرت ذوق کا یہ خیال کتنا حسب موقع ہے:

وہ دل کہ جس میں سوز محبت نہ ہوائے ذوق

بہتر ہے اس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

وہ زندگی کتنی بے مزہ ہے کہ جو لذائذِ محبت سے بے گانہ ہے۔ بقول غالب:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حضرت جوشؔ کی محولہ بالا تعریف کس قدر موزوں و بر محل ہے۔ مجھے اس موقع پر حضرت حالیؔ کا ایک شعر یاد آتا ہے اگر اسے حضرت حالیؔ کی حیات شاعرانہ کا ماحصل کہہ دوں تو قطعاً مبالغہ نہ سمجھیے گا۔

آہا کس قدر حقیقتیں اور کیفیتیں اس شعر میں ہیں:

عشق کہتے ہیں جسے لوگ یہی ہے شاید

خود بخود دِل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

خلاف مرضی، خود بخود آغازِ محبت میں ایک شخص کا دل میں سمانا حقیقت ہے جسے حضرت حالیؔ نے خوشگوار ترین رنگ میں ادا کیا۔ کسی ہندوستانی فلاسفر کے مزید خیالات اس موضوع پر ملاحظہ ہوں:

''محبت کیا ہے۔ طوفانی دنیا کی سب سے اونچی موج، سوز و گداز کی بنسری کا

سب سے بلند نغمہ، خارستانِ اضطراب کا سب سے بڑا کانٹا۔ چھالوں کی کسک کا جوہر، سوز و گداز کی روح، سوزش و شورش کا ست، رباب جنوں کا گرجتا ہوا نالہ، زہر ہلاہل کا چھلکتا ہوا پیالہ، کتابِ فنا کا پہلا ورق، کلیات حیات کا آخری باب، خودداریاں سلب کرنے والا آلہ۔ نظام ہستی بدل دینے والا انقلاب، پہاڑوں کو اڑا دینے والا بارود، دل و دماغ میں تلاطم اٹھا دینے والا زلزلہ، آرام کی آندھی، عافیت کی وبا، صحرائے امن کا رہزن، استقلال کا حاکم، دربارِ حسن کا گدا، حسن کے سوال کا پورا پورا جواب۔''

جہاں تک میرا خیال ہے یہ الفت کا خوفناک پہلو ہے۔ ورنہ اہلِ دل کے ہاں محبت کا ہر باب بے حد دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں دل فریبیاں محسوس کی جاتی ہیں۔ لیکن رہینِ بیان نہیں ہو سکتی۔ حضرت اقبال:

عشق کی راہ میں اک لہر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت نہیں ، مصر کا بازار آیا
خاک ہو کر وہ ملا اوج تری الفت میں
کہ فرشتوں نے لیا بہرِ تیمّم مجھ کو
طور پہ تو نے جو اے حضرت موسیٰ دیکھا
وہی کچھ قیس نے بھی دیکھا پسِ محمل سے
دل جو بربادِ محبت ہوا آباد ہوا
سازِ تعمیر ہے اس قصر کا ویران ہونا
مزرعۂ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
ناز جس دل پہ ہو خالق کو وہ ہے دل میرا

اگر جناب جوش الفت کے بھیانک پہلو سے گھبراتے ہیں تو حضرت اقبال موسیقی زارِ محبت سے وہ ترانے سنتے ہیں کہ سراپا مستی بن رہے ہیں۔ وہ خارستان الفت میں پابرہنہ اس لیے جاتے ہیں کہ خلش میں غیر محدود لذت پاتے ہیں۔ آپ کے ہاں زندگی قطعاً بے لطف ہے۔ اگر اس کی محبتیں آزارِ ہجر سے نا آشنا ہیں۔ اگر اس کی گل چینیاں خلش خار سے ناواقف ہیں۔ اگر اس کی استراحتیں کلفتوں سے بے گانہ ہیں۔

آپ کے ہاں زندگی کشمکشِ امید وبیم کا دوسرا نام ہے۔ جس زندگی میں جمود ہو جو نا آشنائے طغیانی ہو، یقیناً زندگی نہیں۔ ملاحظہ ہو!

زندگانی کی حقیقت کوہکن سے پوچھیے

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

کون نہیں جانتا کہ بحرِ حیات میں سب سے بڑی موج محبت ہے۔ مصارف ہستی میں سب سے بڑی جنگ الفت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص بڑے بڑے خطروں سے الجھے، خوفناک ہلاکت میں کود پڑے، تو بقول غالب!

ع مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اس کی مشکلیں سہل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے محبت کے دشوار پسندوں کو موت نہیں آتی۔ فنا ان کے جادۂ حیات کی پہلی منزل ہے۔ عدم ان کی کلیات زندگی کا پہلا ورق ہے۔ انھی کے دم سے برکت ہے، کہ محبت خود غیر فانی سمجھی جانے لگی ہے۔ ملاحظہ ہو کسی انگریزی فلاسفر کے خیالات لکھتا ہے۔

"محبت حُسن سے نہیں پیدا ہوتی۔ جس طرح کہ بہار پھول سے نہیں بنتی بلکہ پھولوں کو بہار بناتی ہے۔ محبت غیر فانی، سرمدی اور ابدی ہے۔ ایک اور بیان ملاحظہ ہو۔

ترجمہ: محبت کا حسن مستعار نہیں، زمانے کے ہاتھ اسے بوسیدہ نہیں بناتے بلکہ اس کا حسن بڑھاتے ہیں۔ شجر محبت بہار و خزاں سے مستغنی ہے۔ ہر موسم میں اس سے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ اور ہر زمانے میں اس پر بہار کی رنگینیاں، قربان ہوتی رہتی ہیں۔

حضرات! محبت کا سب سے مشکل پہلو، احساسِ محبت ہے۔ اس محبت سے قطع نظر کیجیے جو ہمیں فطرت، مناظر فطرت کی لامحدود نیرنگیوں سے ہے۔ جو ہمیں برسات، گھٹاؤں اور گھٹا بنانے والے سے ہے۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے محبت کے اس تنگ دائرہ کی طرف آیئے جہاں ہم میں سے ہر متنفس ہو کر گذرتا ہے۔ میرا مقصد اس تنگ دائرہ سے وہ عارضی و ناپائیدار دل بستگی ہے۔ جس نے بنی نوع انسان کو باصورتِ دگر باندھ لیا ہے۔

حضرت ٹیگور نے اس پہلو کو لے کر اس زبردست، بلند اور لطیف ترین تخیل کا اظہار کیا ہے جسے اس موضوع پر آخری تخیل کہا جا سکتا ہے کس قدر بے ساختگی سے آپ فرماتے ہیں:

"They met, they saw each other and grew confidnetial" یعنی وہ دونوں ملے۔ ایک دوسرے کو دیکھا، اور ان کا ہر احساس رازِ نہاں بن کر رہ گیا۔

کیا بے ساختگی ہے۔ کس قدر عمیق جذبات اس فقرے میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ کہ جن کا الفاظ میں منتقل کرنا مشکل ہے۔

حضرات!

محبت پر یہ بہت مختصر سی روشنی ڈالنے کے بعد میں فلسفہ واستدلال جیسے بلند پہلو کی طرف آپ کی توجہ صرف چند منٹ کے لیے مبذول کراؤنگا۔اس پہلو کے ضمن میں بے شمار دل چسپیاں ہیں۔اگر مجھے پوری آزادی ہوتی تو آپ دیکھتے کہ یہ پہلو خوشگوارترین ہونے کے علاوہ کس قدر اہم ہےاور کہ اس استدلال سے شعرانے دنیا کے انقلابات میں کیا حصہ لیا۔

وہ شعریت جواس عنوان کے ماتحت لائی جاسکتی ہے،دنیا کے موجودہ دورارتقا کی کافی حدتک معاون ومددرہی،اور ہے میں اس ضمن میں کسی حدتک آزادی سے کام لوں گا۔اورآپ کے سامنے مختلف حیثیتوں سے شعراء کازوراستدلال پیش کروں گا۔یہاں پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں استدلال کے معنی واضح کردوں تاکہ آپ محظوظ ہوسکیں۔

استدلال سے مقصد یہ ہے کہ وکلا کی طرح کسی پہلو کو لے کراپنے زوردلائل سے اتنا مضبوط کردینا کہ وہ ناقابلِ شکست ہوجائے۔مثلاً،مرزاغالبؔ میدان قیامت میں پہونچتے ہیں اعمال نامہ کھلتا ہے تو سفیدی نام کونہیں پاتے۔پہلے تو سٹ پٹا جاتے ہیں لیکن فوراً ہی حواس سنبھال کر اللہ میاں کی انتظامی قابلیت پر اعتراض جڑ دیتے ہیں۔ملاحظہ ہو!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ماشاء اللہ کس قدر انوکھا استدلال ہے۔مجھے امید نہیں کہ اللہ میاں کو صحیح جواب قیامت تک سوجھے۔

دنیا کے عیش گذشتہ کا ملنا محال ہے۔مرزاغالب اس مضمون کو یوں ادافرماتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

دنیا میں وہی قوم زندہ کہی جاتی ہے جس کے دعووں میں بلند آہنگی ہو۔ جو قول کی بجائے عمل پر زور دے، جو ہزاروں میل کی مسافت سے روزانہ جا رہی ہو۔ لیکن بجلی کی طرح کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہندوستان میں دو بڑی قومیں یعنی ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔ مسلمان جب کچھ کرنے لگتے ہیں۔ تو پہلے کانفرنسوں پر زور دیتے ہیں۔ پھر ریزولیوشنوں کی شکل میں اپنا دستور العمل بناتے ہیں۔ پھر تقریرات و تحریرات کا وہ طوفان اٹھاتے ہیں کہ ان کا تمام زور یہیں صرف ہو جاتا ہے۔ اور ان کی دنیائے عمل ویسی کی ویسی بے بہرہ رہتی ہے۔ اس مضمون پر حضرت اقبال نے کیوں کر زور استدلال دیا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز
مانند برق تیز ، مثال ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش

مینا مدام شورشِ قلقل سے پا بہ گل

لیکن مزاجِ جامِ خرام آشنا خموش

زورِ استدلال کا ایک پہلو، دردناک اندازِ بیاں ہے انسانی طبیعت کو دو ہی چیزیں متاثر کرسکتی ہیں۔ استدلال یا دردناک طرزِ بیاں، اگر ایک آدمی دلائل کے زور سے اپنے خیالات منوا رہا ہے۔ تو دوسری طرف ایک بیوہ کی کراہ شب سیاہ کی خاموشیوں میں یقیناً سینوں کو لرزا دے گی۔ کلیجوں کو پھاڑ دے گی۔

ایرانی شاعر زمانہ کی ناپائیداری، ایام بہار کی قلیل الفرصتیوں کا شکوہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بروئے سبزہ و گل خواستم کہ مے نوشم

ز شیشہ تا بقدح ریختم بہار گذشت

اس شاعر نے اس شعر میں مایوسی کی انتہا کردی۔ یہ اندازِ بیان کچھ اسی طرح کا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف شاعر سے احساس ہمدردی بیدار ہوتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف دنیا کی لذت طلبیوں سے دل میں ایک گونہ تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو حضرت حفیظ نے Blank verses یعنی بے قافیہ نظم میں باندھا ہے۔ اور خوب باندھا ہے۔ تخیل، سوز، حسن تشبیہات پر سہ لطائف یکجا جمع کر دیتے ہیں۔

ع یوں وقت گذرتا ہے فرصت کی تمنا میں

وغیرہ

اسی خیال کو ایک انگریزی شاعر نے لیا ہے۔ پیرایۂ اسلوبِ بیان اور سادگی کا انداز بے حد قابل تعریف ہے۔

ترجمہ: اس مصائب سے لبریز زندگی کا فائدہ کیا، اگر لذائذ دہر سے ہم مستفید نہ ہو سکیں۔ ہمیں تو اتنی فرصت نہیں کہ سرسبز درختوں کی، جھومنے والی شاخوں کے نیچے کچھ دیر دم لے سکیں۔ جب ہم گھنے جنگل سے گذرتے ہیں۔ ہم گلہری چوہوں کو ادھر ادھر پھدکتے دیکھتے ہیں لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ان کے ننھے ننھے گھونسلے جھاڑیوں کی گود میں تلاش کر سکیں۔

ہم کسی مطربہ حسینہ کو ناچتے گاتے دیکھتے ہیں۔ لیکن اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم اس خوشی کو جو اس حسینہ کی آنکھوں سے شروع ہوتی ہے چہرے تک آتا دیکھ سکیں۔ کیا بلند خیال ہے کہ اسی خوشی کو۔۔۔۔۔۔ واقعی قدرت جب شاعری اور اس کے لوازمات تقسیم کر رہی تھی، سلیم الدماغی واحد یورپ کے حصہ میں آئی تھی۔

بروٹس (Breutos) مشہور رومن نے فرمانروائے وقت یعنی قیصر کو حریصِ جاہ دولت دیکھ کر اندازہ لگایا کہ روم تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ سازش کر کے اسے قتل کر دیا۔ عوام الناس کے ہاں قیصر نہایت عزت و حرمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام روم میں ایک غیر معمولی تہلکہ مچ گیا۔ Breutos کو کہا گیا کہ وہ اس حیرت ناک اور اہم قتل کی وجہ شارع عام میں آ کر عوام الناس کے ذہن نشین کرائے۔ چنانچہ وہ آتا ہے شیکسپیئر وہاں اپنی طبیعت کا زور یوں دکھاتا ہے۔

ترجمہ:۔

اہلیان ملک، نوجوانانِ وطن و محبانِ قوم میری گذارش کو سنیے اور خاموش ہو جائیے۔ تا کہ آپ سن سکیں۔ آپ کو میری عزت کی قسم کی میری بات پر یقین کیجیے۔ مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھئے تا کہ آپ کو یقین آ جائے، میری گذارشات کا اندازہ

عقل سے کیجئے اور اپنے حواس کو سنبھالیے تا کہ آپ اندازہ لگا سکیں۔

میں نے قیصر کو قتل کیا نہ اس لیے کہ مجھے اس سے محبت کم تھی۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے روم سے محبت زیادہ تھی۔

کیا آپ چاہتے تھے کہ قیصر زندہ رہتا اور سارا روم تباہ ہو جاتا یا یہ کہ قیصر مرتا تا کہ روم زندہ رہتا۔

اس لیے کہ قیصر مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میں اس کی وفات پر روتا ہوں، اس لیے کہ وہ خوش قسمت تھا میں اس کی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوں اس لیے کہ وہ جوانمرد تھا۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس لیے کہ وہ حریصِ جاہ و مال تھا۔ اس کے خلاف تلوار لے کر اٹھا ہوں۔

تمام روم کی آزاد زمین میں کوئی ایسا رذیل ہے۔ جو غلام بن کر رہنا چاہے۔ کوئی ایسا پس فطرت ہے جو سچا رومن نہ ہو، کوئی ایسا ذلیل طینت ہے جسے اپنے وطن سے محبت نہ ہو۔ اگر کوئی ہے تو اسے کہدو کہ میں نے اسی کے لیے قیصر کا سر اڑایا ہے۔ میں جواب کے لیے ٹھہرتا ہوں۔

حضرت بروٹس کی یہ وہ عالم گیر تقریر تھی جسے روم کو اس سرے سے اس سرے تک آگ لگادی۔ ہر متنفس جذبۂ وطنیت سے سرشار ہو گیا۔ ہر چہرہ آزادی اور حریّت کے تصور سے جگمگا اٹھا اور ایک غل بلند ہوا۔

Crown Brutus

crwon Brutus

Long live Brutus

اسے کہتے ہیں زورِ تخیل اور بلندئی استدلال۔

قیصر کا دوست "Antony" اسے خاک وخون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر کس قدر دردناک الفاظ میں اسے خطاب کرتا ہے۔

"او دنیا کو راز دینے والے سیزر۔ کیا تمہارا انجام اتنا حیرت انگیز تھا، کیا تمہاری عالمگیر فتوحات، شاندار کامیابیاں، تمہارے حیرت انگیز جنگی کارنامے، اور خیرہ ساز تدابیر ملک کی انتہا، اتنے تاسف خیز اور سبق آموز تھے۔ او خون میں لتھڑے ہوئے زمین کے منجمد ٹکڑے میں تمہارے بے رحم اور جلاد قاتلوں کے زبردست ہاتھوں میں مجبور ہوں۔ حقیقتاً تو نسل انسانی کی بلند ترین تباہ شدہ عمارت ہے جو زمانے کے طوفان میں کبھی تعمیر ہوئی تھی۔"

ایک جج کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ صورت مقدمہ یوں ہے کہ مدعی نے مدعا علیہ کو اس شرط پر قرض دیا کہ اگر وہ میعادِ مقررہ کے اندر اندر ادا نہ کرے تو اس کے کسی حصہ جسم کا آدھ سیر گوشت کاٹ لیا جائے۔

چنانچہ مدعا علیہ قرض ادا نہ کر سکا۔ مجبوراً وہ شرط مذکورہ کے ذیل میں آگیا۔ جج مدعی سے کہتا ہے کہ وہ خود قرض دو چند، ہزار چند دینے کے لیے تیار ہے۔ اگر مدعی شرط سے دست برداری دے۔ لیکن مدعی، مدعا علیہ کی جان لینے پر کسی قدیم مخالفت کی بنا پر تلا ہوا ہے۔ اور کسی دلیل اور کسی اپیل کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلہ میں جج رحم کی اپیل کرتا ہے۔ لیکن ان الفاظ میں:

"رحم قادرِ مطلق کی حسین ترین نعمت ہے۔ جو آسمانوں سے برسات کی خوبصورت بارشوں کی طرح اہل زمین پر برستی ہے۔ اس کے پہلو میں ہر طرح کی

رحمتیں ہوتی ہیں۔ رحم قدرت کی بہترین ایجاد ہے۔ رحم ایک فرمانروا کو عصائے خسروی سے زیادہ زیب دیتا ہے۔ اس کی عصا ظاہری جاہ وعظمت کی علامت ہے اور رحم اس کے اندرونی حسن اخلاق کا پتہ دیتا ہے۔ رحم شاہی دلوں میں ہوتا ہے۔ جب انصاف کے ساتھ رحم شامل ہو جائے تو بادشاہ خدا نما معلوم ہوتا ہے۔"

مدعی نے اپنا مقدمہ واپس لے لیا اور معاف کر دیا۔

• حضرات میرا وقت بیس منٹ سے زیادہ نہیں بس میں اپنے مضمون کو بلا تکمیل ختم کرتے ہوئے سمع خراشی کے لیے عفو کا طلب گار ہوں۔

[غیر مطبوعہ]

☆☆☆

نیچر اور عاشق کا دلچسپ مکالمہ

نیچر: ''دیکھو تو! یہ عشاق کتنے احمق ہیں! برسوں کسی کی جستجو میں جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں، آبادیوں سے کوسوں دور، بربادیوں میں موسموں کے تغیر، حوادثِ ارضی وسماوی کی آماج گاہ بنتے ہیں، ان کی اُمیدیں بن بن کر ٹوٹتی ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کر درد میں تبدیل ہوتی ہیں، ان کی بیتاب تمنّائیں بے قرار پہلو سے اُٹھ اُٹھ کر سامانِ حشر بنتی ہیں اور خاک میں ملتی ہیں، لیکن یہ عزم کے پکے، من کے ضدی نہ تو گیسوئے دراز کا سلسلہ ہاتھ سے دیتے ہیں اور نہ خرامِ ناز، ناوکِ نگاہ، خنجرِ ابرو اور گلِ عارض کی یاد سے باز آتے ہیں۔ روتے ہیں، تڑپتے ہیں، لوٹتے ہیں اور فراق کی تاریک و تنہا راتوں میں بقولِ امیرؔ:

جی اکیلے شبِ فرقت میں جو گھبراتا ہے
فتنۂ حشر کو نالوں سے جگا لیتے ہیں

آہ! انھیں کون سمجھائے، کہ میری گود میں ان کے اطمینان کا مکمّل سامان موجود ہے، بیاباں کی وسیع گود میں غزالِ رعنا کا مستانہ رقص! کیا خرامِ محبوب سے کم دل رُبا ہے؟ کوہسار کے رنگیں دامن میں ارغوانی پھولوں کی سنہری وادیاں، کیا آرام گہِ جاناں سے خوب تر نہیں؟

ہنگامہ بہ آغوش جھیل کی سکوت پرور گہرائیوں میں شب کو متبسّم مہتاب کی بشاش دُنیا، حیرت انگیز ضیا ریزی میں مصروف ہے۔ صبیح سیاروں کی شیر آلود و مخمور نگاہیں، حواسِ عالم کی خریدار ہو رہی ہیں۔ اُدھر بہار آرا مرغزاروں میں عنادل کے چہچہوں سے ترنم

مترشح ہو رہا ہے، اِدھر عطریت پاش لالہ زاروں کے پہلو میں آب جو کی ہلکی ہلکی موجیں، شکنِ گیسو کا پیام دے رہی ہیں۔ نسیمِ رقّاص کے شمیم آلود تنفّس میں عنبریت موّاج ہے۔ شاخِ گل کے شبابِ مستانہ میں نزاکت لرزاں ہے۔

حیف!! کہ یہ عشاق، عارضِ مہتاب، نگاہِ انجم، حنائے شفق، تنفّسِ نسیم، ترنمِ جُو، شکنِ امواج، خرامِ آہو و دیگر بیش بہا و ارزاں مناظرِ قدرت سے منہ پھیر کر، کسی ناممکن الحصول تمنّا کی جستجو میں، متاعِ عمر کو کھو دیتے ہیں؛ حیف! ان کی یاس آلود مساعی، وتُف اُن کی شوریدہ مذاقی پر!!!"

عاشق: (ذرا جھنجھلا کر) "ہاں تیرے پاس سب کُچھ ہے،

صرف ______ انسانیت __________ نہیں!!!

[مطبوعہ در "قوسِ قزح" ___ جنوری ۱۹۲۶ء]

☆☆☆

عمل چغتائیت

نیرنگ خیال، عالمگیر و ہمچور سائل میں بار ہا ایسی تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا جنھیں حضرت چغتائی کے قلمِ حسن تراش کا سحرِ جمیل سمجھا گیا۔

حضرت چغتائی کا یہ جرم کسی حد تک دنیائے مذاق میں قابل برداشت ہوتا اگر ایڈیٹروں کے تعریفی مبالغہ آمیز نوٹ اس جرم کو زیادہ خوفناک نہ بنا دیتے۔ میرا مقصد اس تحریر سے تعریفیں نہیں تہنیم ہے۔ یا تو میں بری طرح بد مذاق ہوں کہ ہندوستان کے اس مصورِ اعظم کی نقاشیوں میں بھراوہ حسن دیکھ نہیں سکتا۔ یا اتنا بدمذاق ہوں کہ اپنی بد مذاقی کا علم نہیں۔ وجہ کچھ ہو ''عملِ چغتائیت'' کے حسن و قبح پہ آج ہم بحث کر کے رہیں گے۔ اور قطعاً کسی سے نہیں ڈرتے۔

سنیئے صاحب! حضرت چغتائی کا شاہکار یعنی لیلیٰ نجد'' ۔۔۔؟ میرے سامنے ہے۔ یہ تو ہم شروع سے سنتے آئے ہیں کہ لیلیٰ سیاہ فام تھی لیکن یہ سنتے ہی خیال آجاتا ہے کہ سیاہ فام یا سبز فام ہونا حسن پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ حسن تناسب خط و خال کا نام ہے۔ ہم خود بسا اوقات ابیض اللون حسن فروشوں کے دام نظر سے بچ نکلے ہیں۔ لیکن ایک سبز فام ملیح الحسن کی شرمیلی اداؤں کا اس بری طرح شکار ہوئے کہ قیس و فرہاد کے کارنامے افسانے بنا دیتے ہیں۔ تو خیر، لیلیٰ کے سبز فام یا سیاہ فام ہونے پر نہ ہمیں اعتراض تھا اور نہ جناب قیس کے عشق میں سیاہ فامی رخنہ انداز ہوسکی۔

ہمیں کل سے جامع مسجد کے مولوی صاحب نے پورے تین عدد عربی کے اشعار یاد کرار کھے ہیں۔ سنا ہے کہ عربی بے حد دیر ہضم چیز ہے۔ بات وہی نکلی۔ ہم کل

شام سے اب تک کاغذ نکال، اعراب کو خوب دیکھ بھال کر یہ تین شعر یاد کرنے کے در پے ہیں۔ کہ کہیں عربی دانوں کی محفل میں گذر ہو تو ہم بھی محفل پر حجازی الطبع ہونے کا رعب جما سکیں۔ نیز، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی، مولانا صفدر کے دفعتہً "مولانا" بن جانے کی وجوہات بغیر اس کے کیا ہے۔ کہ قرآن حکیم کی ایک دو آیتیں بمع ترجمہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے پڑھ لیں اور علی گڑھیوں، اسلامیہ کالجیوں، اور گورنمنٹ کالجیوں پر خلافت کانفرنس، کانگریس، مسلم لیگ اور کشمیری کانفرنس کے پنڈال میں اپنے عربی المذاق اور عربی الاصل ہونے کا سکہ بٹھانا شروع کر دیا۔

لیکن جس دماغ میں سالہا سال سے شیکسپئر، پوپ، اور ملٹن کی زندہ زبان بس رہی ہو۔ وہاں غریب، بوسیدہ، مفلس اور قلاش عربی کو کون گھسنے دیتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوا۔ ہم نے ایک دو گھنٹے کے رٹہ پر بمشکل ایک شعر یاد کیا۔ جونہی ہم دوسرے شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔ انگریزی نے ہنٹر لے کر پٹاخ پٹاخ دو چار چانٹے عربی کو ایسے رسید کیے کہ جناب عربی کے قبلہ شعر صاحب! موزۂ و دست کو وہی پھینک۔ قبا و سجادہ سنبھال بمع ریش مطول، ہوا و فضا میں آوارہ نظر آئے۔ ہم ہزار طرح سمجھاتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں الحاح وزاری سے کام لیتے ہیں۔ ہر طرح مناتے ہیں۔ لیکن حضرت پیرزادہ جناب شعر صاحب عربی، مکی، مدنی، چشتی، نقش بندی کچھ اس بلا کے بگڑے ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔ تو ہم مجبوراً اس وقت کاغذ سے دیکھ کر صفحہ ھٰذا کو ایک عدد عربی شعر سے زندگی میں بالکل پہلی دفعہ مزین فرمانے لگے ہیں۔

لیجئے جناب سنیئے شعر بھی جناب قیس (مجنوں) کا ہے

اعوذ با اللہ السمیع العلیم الکبیر الرحیم الکریم الاکبر من الشیطان للعین المردود الخبیث النحس الملعون الحرامزادہ الیمان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (عربی ختم) (کھانستا برائے صفائے گلو) آج کل، اعوذ باللہ اسی طرح پڑھا جا رہا ہے گویا نئی روشنی کا مہذب متمدن اور ماڈرن اعوذ باللہ بھی ہے۔

یقولون لیلٰے سودۃ حبشہ
ولولا سواد المسک ما کان غالبا

ترجمہ شریف:

لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ سیاہ فام اور حبشی اللون ہے۔ یہ لوگ سیاہی کی قیمت کیا جانیں اگر مشک (کستوری) سیاہ فام نہ ہوتی تو اتنی گراں بہا نہ ہوتی۔

میرا مقصد اس شعر کے نقل کرنے سے جہاں اپنی عربی دانی کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ وہاں یہ بھی بتلانا منظور ہے کہ گو لیلیٰ سیاہ فام تھی لیکن اتنی متناسب الاعضا اور مطابق الجوارح تھی کہ اس کے دام تناسب میں پھنس کر قیس مجنوں بن گیا۔

لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ اہل مشرق نے اتنی بار دہرایا ہے کہ ہر ادب پر لیلیٰ و مجنوں کا ایک خاص تصور جم گیا ہے۔ نیز ارباب شہرت کو دیکھنا ہر انسان کا فطری جذبہ ہے۔ سن شعور سے میری خواہش تھی کہ حافظ، سعدی، مولانا روم، فرہاد و شیریں، لیلیٰ و مجنوں، پیران پیر، بایزید بسطامی اور دیگر اجارہ دارنِ بقائے دوام کو کہیں سے دیکھ

جلی لکھا ہوا تھا کہ صفحہ اول پر شاہکار چغتائی یعنی تصویر لیلیٰ سے مزین ہوگا۔ بس اس
نوٹ کا پڑھنا تھا کہ ہم نے باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ، جھٹ پٹ نہایت پھرتی و چستی
سے ورق اٹھایا۔ ہماری نگاہ صفحہ اول پر پڑی، معاً ہماری تمام چستیاں ایک بھیانک
مردنی میں تبدیل ہو گئیں۔ رسالہ رکھ دیا ہوا، اوراق گردانیوں پر ایدن وپڑیدن
(بروزن چلیدن) میں مصروف ہے اور ہم ہیں کہ ایک نیم گرم افسردگی میں ڈوبے جا
رہے ہیں۔ اور حیران ہیں کہ یاالٰہی وہ لیلیٰ یہی ہے۔ جس کا چرچا ایوان جہاں میں
اب تک ہے۔ جس کا حسن قیس کو غیر فانی بنا گیا۔ زمینِ نجد کا ہر ذرہ قابل پرستش بنا
دیا۔ جس کا کلمہ دنیا آنے والی دنیا تک پڑھے گی۔

کیا یہ وہی لیلیٰ ہے، کیا قیس اس لیلیٰ کا شیدائی تھا۔ سنا ہے قیس شاعر تھا۔ ہم
جناب قبلہ قیس جل شانہٗ کا ایک شعر پیش فرما چکے ہیں اور ان کی مزید شاعری کا ثبوت
ایک دو اور اشعار لکھ دینا چاہتے ہیں۔

(یہ واضح رہے کہ یہ تین یا چار شعر ہماری وہ تمام کائنات ہیں جو ایک ٹھیکیدار
عربی (آپ اس اضافہ پر حیران ہوں کہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے انشا
پردازوں نے "برلب سڑک" کی اضافت ایجاد فرما کر ٹھیکیدار عربی یا مثل آں دیگر
اضافتوں پر صاد کر دیا ہے) یعنی امام مسجد سے ہمیں بعد از ہزار جنگ و پیکار وصول
ہوئے ہیں۔ ہاں تو وہ شعر یہ ہیں:

مجنوں علیہ السلام فرماتے ہیں:

شفی اللہ مرضیٰ با العراق و اننّی

علٰی کُلِ مرضٰی باالعراق شفیق"

ترجمہ:۔لوگ کہتے ہیں کہ عراق میں لیلٰی بیمار ہے۔

تو عاشق صادق کا مدعی کیوں بیمار نہیں ہوتا۔

اللہ مریضہ عراق کو شفا دے (دلیل دیکھیے) کیونکہ

مجھے عراق کے ہر بیمار سے بے حد ہمدردی ہے۔

اور سنیے:

تمتّعَ مَن شمیم عرارِ نجد

وما بعد العیشة من عراء

مسافر قیس مرغزارِ نجد کے شمیم سے متمتع ہوئے کہ شام کے بعد تو تیری روشنی مجھے لے کر بہت دور نکل گئی ہوگی۔

دیکھا جناب مجنوں کتنا صحیح المذاق، بلند پایہ اور عالی تخیل شاعر تھا۔ کیا ایسے شاعر سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اس لیلٰی کا گرفتارِ الفت بنے جس کی تصویر نیرنگ خیال کے صفحہ اولٰی پر ہے۔ تصویر کیا ہے۔ ایک نہایت بھدّی، طویل قامت عورت اوّل تو آنکھیں ندارد۔ اگر ہیں بھی تو آلہ خوردبین کی منت کش لباس ہندوستانی بال زلفیں بوضع گوندھی ہوئی، چہرہ خشک، بدن لاغر، جھریاں پڑی ہوئی۔ پیشانی پست، ناک بری طرح بدنما و ناموزوں، رنگ زرد پھیکا۔ گویا ۱۵ سال سے مریضہ، تپ دق ہے (غالباً قیس کے اشعار گذشتہ میں "یقولون لیلٰی باالعراق مریضہ" کی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے)۔

عمر ۴۵، ۵۰ کے درمیان ، الغرض لیلیٰ کیا ہے ایک ''مکروہ الصورت و اصفراللون'' بھونڈی الشکل (ترکیب چست ہے اس لیے درج ہوئی) خاندان ''عفریت'' کی ایک دائمی المرض بڑھیا ہے۔ قیس کی والدہ ماجدہ سے لیلیٰ کی عمر کیا کم ہوگی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ قیس جیسا بلند پایہ سلیم الفطرت شاعر ایسی چڑیل کا دل دادہ ہو۔ ہرگز نہیں۔

ہم اور جناب نیازؔ۔ صدق دل سے شہادت دیتے ہیں اس بات پر کہ ایک شاعر خواہ کتنا ہی پست مذاق، پست تخیل اور پست فطرت کیوں نہ ہو۔ ایسی لیلیٰ کا عاشق ہو، ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیا قیس کوئی مکھی تھا کہ گیسوئے لیلیٰ (چغتائی لیلیٰ) کے تارِ عنکبوت میں بادلِ ناخواستہ اُلجھ کر رہ جاتا۔ بہ الفاظِ دیگر حضرت چغتائی نے ایسی لیلیٰ بنا کر جہاں قیس کے مذاق پر خطرناک حملہ کیا ہے۔ وہاں شعرائے ہند کو متحدالسخن کی حیثیت میں صدمہ پہنچایا ہے۔ کم ازکم میں اور حضرت نیازؔ ہرگز برداشت نہیں کرسکیں گے۔ کہ پہنائے ہند میں کوئی مرد یا عورت یا وہ جو مرد بننے یا وہ جو عورت بننے (طلبائے کالج) کی کوشش میں مصروف ہو، یا ظاہراً، باطناً، اصالتاً، وکالتاً، ڈائرکٹاً (بروزن فوراً) یا ان ڈائریکٹاً شعرائے عظام پر یا اُن کے مذاق پر حملہ آور ہو چکا ہو، یا ہونے کی کوشش کررہا ہو، کیونکہ اس سے جہاں ہماری (Prestage) (اقتدار ملکی ووطنی) کے برہم ہونے کا خطرہ ہے۔ وہاں تخلیق جسم کا منشا نہ پورا ہونے کا احتمال ہے۔ یعنی اگر شعراء کی تعداد میں معتد بہ کمی آگئی (چنانچہ عملِ چغتائیت کو دیکھ کر احتمال ہو ہی رہا ہے) تو وسعتِ جہنم کو لبریز کرنے کے لیے جہاں دنیا کا عرصۂ حیات قدرت کو اور بڑھانا پڑے

گا۔ وہاں خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے کئی ''خلافتی مولانا'' تلاش کرنا پڑیں گے۔
کیا چغتائی صاحب! و دیگر مصورانِ ہند میری گذارش پر توجہ دیں گے۔

[غیر مطبوعہ: ۲۹۔ جون ۱۹۲۹ء]

☆☆☆

محکمۂ تعلیم پر آج بھی ہندوؤں کا قبضہ ہے

نوٹ: لالہ سیوک رام نے بعض ہندو جرائد میں محکمۂ تعلیم کے متعلق چند مضامین چھپوائے تھے۔ جن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سر فیروز خان نون وزیرِ تعلیمات اور خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب مسلمانوں کو ملازمتیں دے رہے ہیں اور ہندوؤں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ جو سلسلہ مضامین ہم آج شروع کر رہے ہیں اس کا مدّعا یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کی حقیقی حالت سامنے آ جائے۔ اُمید ہے کہ ہندو اس سلسلۂ مضامین کو پڑھ کر عبرت حاصل کریں گے اور اپنے شور و غل پر پشیمان ہوں گے۔ (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب، لاہور)

ٹریبون کی مختلف اشاعتوں میں مجھے لالہ سیوک رام کے چند خطوط محکمہ تعلیم کی فرقہ وارانہ حکمت عملی پر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ لالہ صاحب محکمہ کی بے انصافی پر بہت چراغ پا ہو رہے ہیں۔ اور پنجاب کی اقلیتوں کے ساتھ بے انصافی دیکھ کر آپ کافی زیادہ مضطرب نظر آتے ہیں۔

عدل و انصاف کی حمایت کا خیال نہایت مبارک قابلِ تحسین ہے اللہ کرے۔ کہ آپ جیسے علمبرداران رواداری اور مروت و حامیانِ انصاف کا وجود دنیا میں ہمیشہ باقی رہے۔ تاکہ اقوام و ملل جادۂ اعتدال سے منحرف ہو کر امن عالم کی برہمی کا باعث نہ بنیں۔ لیکن کیا میں لالہ صاحب سے پوچھ سکتا ہوں، کہ کبھی جناب نے محکمۂ زراعت، ڈاک خانہ جات، ہائیڈرو الیکٹرک برانچ ریلوے اور انجیئرنگ میں مسلمانوں کے تناسب پر بھی غور کیا؟

کبھی پنجاب یونیورسٹی کے گذشتہ پچاس سال کے کارناموں پر بھی نگاہ

ڈالی؟ کبھی دیکھا کہ سنڈیکیٹ، سینیٹ، مختلف فیکلٹیز اور بورڈز میں مسلم کا تناسب کیا ہے؟ کتنے کلرک اور آفیسرز مسلمان ہیں۔ ممتحنین، سپروائزز اور سپرنٹنڈنٹ ہر سال مسلمان کتنے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ تعصب کی عینک اتار کر ان اعدد وشمار پر ایک منٹ کے لیے نگاہ ڈالیں تو مجھے پورا یقین ہے۔ کہ آپ مسلم کے ساتھ اس بے دردانہ سلوک پر تھرّ ا اٹھیں، چونکہ آپ نے اس وقت صرف محکمۂ تعلیم کو اپنی عنایات کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس لیے میں چند حقائق پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تا کہ دنیا کو آپ کے بے معنی واویلا اور محض متعصّبانہ شور وغوغا کی حقیقت معلوم ہو جائے

قبل اس کے کہ میں محکمۂ تعلیم کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کا موجودہ تناسب بتلاؤں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ہم مذہب لالہ منوہر لال صاحب کہ سہ سالہ وزارت کا نچوڑ پیش کروں۔ تا کہ دنیا کو جہاں ایک بھولا ہوا افسانہ یاد آ جائے۔ وہاں ''عدل وانصاف'' کا بہترین نمونہ بھی آئندہ نسلوں کو تقلید کے لیے مل جائے۔

لالہ منوہر لال کے زمانہ میں ترقیاں

گریڈ	کل اسامیاں	مسلم	غیر مسلم	میزان
پی۔ای۔ایس درجۂ اوّل	۱۱	۳	۶	۹
پی۔ای۔ایس درجۂ دوم	۱۸	۸	۲۷	۳۵
میزان	۲۹	۱۱	۳۳	۴۴

براہِ راست تقررات:

مسلم	غیر مسلم	میزان
X	۱۰	۱۰
۲	۱۰	۱۲
۲	۲۰	۲۲

نوٹ: اس شعبہ میں کل تقررات اور ترقیاں ۶۶ ہوئیں۔ جن میں سے مسلم ۱۳اور ہندو ۵۳ تھے۔ کیا لالہ سیوک رام صاحب اس نوشیروانی عدل وانصاف پر غور کریں گے۔

گریڈ	کل اسامیاں	مسلم	غیر مسلم	میزان
ایس۔ای۔ایس				
۲۰۰۔۱۰۔۲۵۰	۸۸	۱۳	۳۲	۴۵
۱۴۰۔۱۰۔۱۹۰	۲۱۴	۳۶	۶۰	۹۶
۱۱۵۔۵۔۱۴۵	۲۹۳	۴۴	۷۵	۱۱۹
۸۰۔۴۔۱۰۰	۲۴۰	۳۹	۷۴	۱۱۳
میزان	۹۳۵	۱۳۲	۲۴۱	۳۷۳

براہِ راست تقررات:

مسلم	غیر مسلم	میزان
۲	۹	۱۱
۱۲	۲۶	۳۸

۲۱	۳۸	۵۹
۲۴	۴۵	٦۹
۵۹	۱۱۸	۱۷۷

ان اعداد کا ماحصل یہ ہے کہ پراونشل سروس میں لالہ منوہر لال نے ٦٦ تقررات کیں۔ جن میں سے صرف ۱۳ مسلمانوں کے حصہ میں آئیں۔ لالہ، سیوک رام صاحب جی بتلائیں۔ کہ کیا یہ انصاف ہے؟ کیا اسی کا نام غیر فرقہ وارانہ حکمت عملی ہے؟ کیا اس سے زیادہ ظلم کی کوئی مثال کہیں اور مل سکتی ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو لالہ سیوک رام صاحب اس وقت کہاں سو رہے تھے؟

کیوں اس بے انصافی کے خلاف صدا بلند نہ کی۔ کیوں ان کی رگِ انسانیت و ہمدردی میں عدل و انصاف کا لہو متلاطم نہ ہوا۔ پھر آگے دیکھیے۔ ملازمتِ ماتحت میں ۵۴۷ تقررات اور ترقیاں ہوئیں۔ جن میں سے صرف ۱۹۱ مسلمانوں کے حصہ میں آئیں۔

کیا اس قوم کا تناسب (جس کی اعدادی طاقت صوبہ میں ۵۷ فیصدی ہے) ملازمتوں میں یہی ہونا چاہیے؟ کیا لالہ صاحب! آپ سابق وزیرِ تعلیم کے ان کارناموں کو پسند کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو کتنی دفعہ کونسل یا پریس میں ان بے انصافیوں کے خلاف صدا بلند کی۔

تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں۔ کہ مسلم بحیثیت قوم جاہل ہیں اور آپ خواندہ، ہم نا قابل ہیں۔ اور آپ قابل، ہم حکومت کے نا اہل ہیں اور آپ اہل، آپ کی تہذیب بہت قدیم اور بلند، ہماری تہذیب جدید اور پست! آپ شاندار

روایاتِ ماضیہ کے حامل ہیں۔ اور ہم ایک تاریک ماضی پر نازاں، آپ رہبری کے اہل اور ہم ادبستانِ تمدن میں ہنوز، طفلِ مکتب، لیکن کیا آپ ہمیں صرف دو منٹ کے لیے اس اسوۂ حسنہ پر چلنے کی اجازت دیں گے۔ جو سر شادی لال اور لالہ منوہر لال جیسے دو معلمان آئین جہانداری نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ ان کی شاندار روایاتِ حکومت کا ماحصل تو صرف اتنا ہے، کہ اپنی قوم کو ہر طرح آگے بڑھاؤ۔ اور دوسروں کے حقوق کو جس قدر پامال کیا جاسکتا ہے۔ کرو، آخر جو سبق آپ نے ہمیں پڑھایا۔ اس پر کیوں نہ عمل کیا جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سر فیروز خان نون اور خان بہادر شیخ نور الٰہی نے ان لوگوں کے "اسوہ حسنہ" کو دستور العملِ حیات نہیں بنایا۔ مسلم کا خمیر انصاف وعدل سے تیار ہوا ہے۔ مسلم کبھی بے انصافی، تعصب اور فرقہ پرستی کی حمایت نہیں کرسکتا۔ آیئے۔ لالہ صاحب! میں آپ کے سامنے محکمۂ تعلیم کی موجودہ ہیئت، ساخت اور ترکیب کا مرقع پیش کروں۔ آپ کو بتلاؤں، کہ مختلف شعبہ ہائے ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے۔ پھر کس قدر قابل مسلم ہند اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ امتیازات حاصل کرنے کے بعد کس طرح کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل نقشے کو ذرا غور سے دیکھیے۔

گورنمنٹ کالجوں کے سینئر سٹاف

مسلم	غیر مسلم	تناسب مسلم
۳۱	۸۹	۲۵٫۳۳

گورنمنٹ ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر

مسلم	غیر مسلم	تناسب مسلم
۵۳	۷۸	۴۰٫۴

ڈویژنل انسپکٹر

۲	۳	۴۰

ڈپٹی انسپکٹرز

۴	۶	۴۰

مندرجہ بالا نقشہ دیکھنے کے بعد بھی اگر لالہ صاحب کی تسلی نہیں ہوئی۔ اور مسلمانوں کے پامالیِ حقوق کی مزید داستان سننا چاہتے ہیں۔ تو ذرا جدول ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

عہدے	مسلم	غیر مسلم	تناسب مسلم
۱۔ آئی۔ای۔ایس	۱	۱۱	۸ء۳۳ فیصدی
۲۔ پی۔ای۔ایس درجہ اول	۶	۹	۴۰ فیصدی
۳۔ پی۔ای۔ایس درجہ دوم	۴۲	۶۹	۸۴ء۳۷ فیصدی

سر فیروز خان نون نے گذشتہ چار سال کے عرصہ میں کیا کیا؟ آپ ہی بتلائیں۔ مسلمانوں کا جو تناسب، اعلیٰ وادنیٰ ملازمتوں میں لالہ منوہر لال صاحب کے زمانے میں تھا۔ اس پر موجودہ وزارت نے کیا اضافہ کیا۔ مسلمان جہاں تھے وہی ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی، خود مختار کارکن نہیں۔ ان کی حیثیت محض ایک ڈپٹی کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قلم نہیں۔ نہ اختیارات ہیں۔ مجھے حیرت ہے۔ کہ آپ ایک بے اختیار حاکم پر کیوں برس رہے ہیں۔ خاں بہادر صاحب کا وہ کون سا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ جس پر آپ اس قدر لعل دو آتش ہو رہے ہیں۔ مسلم کی پامالیِ حقوق اور مظلومی کی داستان جس قدر لالہ منوہر لال صاحب

کے زمانے میں عبرت انگیز تھی۔ تقریباً اتنی ہی سبق آموز اب ہے۔ آپ یقین رکھیں۔ کہ مسلم نے موجودہ وزارت کے زمانے میں کوئی خاص سنبھالا نہیں لیا۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہ آئے۔ تو مندرجہ ذیل نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

گورنمنٹ کالجوں کے پرنسپل

تعداد کالجز	مسلم پرنسپل	غیر مسلم	تناسب
۱۳	۴	۹	۳۰٫۸

سینئر انگلش ٹیچرز گورنمنٹ ہائی سکول میں

۳۸۸	۶۱۹	۳۸٫۵

لالہ صاحب! کیا آپ نے محکمہ تعلیم میں مسلمانوں کی پست حالت کا اندازہ لگایا ہوگا۔ اور آپ کو اب اطمینان ہوگیا ہوگا۔ کہ یہ ۵۷ فیصدی کے نعرے لگانے والے ابھی تک چالیس فیصدی سے اوپر نہیں نکل سکے۔

ممکن ہے۔ جناب کو یہ خیال ہو رہا ہو، کہ واقعی مسلم مردوں کی حالت تو ممکن ہے، اچھی نہ ہو لیکن محکمہ تعلیم کی نوازشات کی موسلا دھار بارشیں مسلم عورتوں پر ضرور ہو رہی ہیں۔ اس لیے تشریف لائیے۔ آپ کو اس دنیا کی بھی سیر کرالائیں۔

زنانہ گورنمنٹ کالج

مسلم عورتیں بحیثیت لیکچرار	غیر مسلم	تناسب
۱	۱۳	۱۴٫۷

گورنمنٹ گرلز ہائی سکول

۵	۹۸	۴٫۸۵

انسپکٹرس واسسٹنٹ انسپکٹرس

x ۱۶ x

اعلیٰ زنانہ ملازمتیں

عہدے	مسلم	غیر مسلم	تناسب
۱۔ آئی۔ای۔ایس	۔	۲۰	۔
۲۔ پی۔ای۔ایس I	۔	۱	۔
۳۔ پی۔ای۔ایس II	۔	۱۰	۔

وہ تھی مردوں کی حالت اور یہ ہے عورتوں کی کیفیت۔اب آپ یہ فرمائیں۔ کہ آپ کیوں اس قدر ناراض ہو رہے ہیں۔وہ کون سی مسلمانوں کی بلندی ہے۔جو جناب کی روح کو اذیت پہنچا رہی ہے۔وہ زمانہ یاد نہیں۔جب تمام ڈویژنوں میں تعلیم کی باگ ڈور غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی۔راولپنڈی میں لالہ رتن لال، انبالہ میں سردار دیوا سنگھ، لاہور میں چودھری گیان سنگھ، جالندھر میں مسٹر من موہن، اور ملتان میں لالہ۔۔۔(نام یاد نہیں) انسپکٹر تھے۔تمام مسلم پریس اس صریح ظلم کے خلاف چلا رہا تھا۔لیکن کیا مجال کہ لالہ منوہر لال کی بارگاہ عالیہ تک ان فریادوں کی رسائی ہو۔اس زمانہ میں جناب کہاں تھے۔پنجاب ہی میں یا آسٹریلیا کے کھیتوں میں غلہ کا بھاؤ دریافت کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

[مطبوعہ: روزنامہ انقلاب۔لاہور بابت: ۲۰۔جون ۱۹۳۴ء]

☆☆☆

جماعت میں کس طرح مضمون لکھایا جائے اور پڑھایا جائے

جنابِ صدر واہل محفل!

یہ ہے آج میری اس تقریر کا عنوان۔

حضرات: یہ مضمون بے حد طویل اور کسی حد تک پیچیدہ ہے۔ اس محدود وقت میں اس مضمون کے ہر پہلو پر بحث کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے آپ کے ہاں اس عنوان وتحریر کی کوئی اہمیت نہ ہو، مگر میرے ہاں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی زد قومی زندگی کے ایک شاندار پہلو پر پڑتی ہے۔ دنیا نے مان لیا ہے کہ زندہ قوم وہی ہے کہ جس کے خزانے جدید علوم وفنون سے مالا مال ہوں جس کی لائبریریاں، جس کے کتب خانے لاثانی ہوں، ہندوستان لاکھ لٹ جائے برباد ہو جائے، مگر اس کی تہذیب نہیں مٹ سکتی۔ جب تک مدراس، دھلی، بنارس اور پنجاب کے کتب خانوں میں کالیداس جیسے مایہ ناز فرزندانِ ہند کے کارنامے موجود ہیں۔

میرا مطلب ان الفاظ سے یہ ہے کہ کوئی قوم شاندار نہیں بن سکتی معزز نہیں ہوسکتی، ارتقا وعروج کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس کالٹریچر (ادب) شاندار نہ ہو۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ہمارے بچے اپنی زبان میں کوئی سطر درست نہ لکھ سکیں اور نہ سمجھیں، تخیل بھونڈا ہو۔ دماغ کج، فطرت مسخ ہو گئی ہو، تو بڑے کہاں سے پیدا ہوں گے۔

کیا یہ ایک تلخ حقیقت نہیں کہ گذشتہ ۱۵۰ سال کی تعلیم نے سکولوں میں سے

کوئی مصنف پیدا نہیں کیا۔ آپ خوش نہ ہوں یہ دیکھ کر آپ کی زبان میں سینکڑوں کتب لکھی جا چکی ہیں کیونکہ تقریباً تمام بہتر مصنفین مثلاً (حالی، شبلی، ابوالکلام، رتن ناتھ سرشار، درگا سہائے، آزاد، شرر، راشدالخیری وغیرہ) آپ کے سکولوں کے طالب علم نہ تھے۔ ان کی تعلیم اپنے طور پر ہوئی تھی۔

اس جلسہ میں ہمارے ڈویژن کے بڑے بڑے انسان تشریف فرما رہے ہیں۔ کتنے ہیں جنھیں یہ دعویٰ ہو کہ وہ خود مصنف ہیں یا ان کے شاگرد۔ کیا کسی صاحب کو یقین ہے کہ اس کی تحریر موجودہ بلند معیار اردو کے مطابق ہے۔ اگر حقیقت یوں نہیں، تو فرمائیے کہ جس ملک میں اساتذہ کرام مروجہ ملکی زبان میں کوئی درست سطر نہ لکھ سکتے ہوں۔ وہاں نسلیں کیسی پیدا ہونگی۔

مجھے ایک گریجوایٹ کا چند روز ہوئے خط ملا۔ جس میں ''السلام علیکم'' کی بجائے ''السلام وعلیکم'' اور واضح کو'ع' سے لکھا گیا تھا۔ کیا یہ قصور اس گریجوایٹ کا ہے۔ نہیں استاد کا ہے طالب علم اپنے استاد کے اخلاق و قابلیت کا عکس ہوتا ہے۔ ایک انگریز فلاسفر کا یہ مقولہ مجھے کتنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ: ''کسی قوم کا مستقبل ٹیچرز کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگر ٹیچر بلند اخلاق اور بلند مشرب ہوں تو مستقبل روشن ہوگا۔ اگر استاد پست ہمت، پست اخلاق اور پس فطرت ہوں، تو مستقبل کا خدا حافظ!

حضرات! جب تک قوم میں بہترین انشا پرداز پیدا نہ ہوں، ہماری تہذیب بلند نہیں ہو سکتی۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ڈویژنل انسپکٹر صاحب کو اس کا احساس ہوا کہ ہماری انشا پردازی پست ہے۔ چنانچہ دوران، معائنہ آپ نے ہدایات صرف

انشا پردازی پہ دیں۔ نیز آپ کے خیالات سے یہی ٹپکتا تھا۔ کہ آپ کو ہماری موجودہ ادبی پستی کا زبردست احساس ہے۔ لیکن ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو بھی اس کا احسان ہونا چاہیے۔ آؤ آج ہم اپنے نقائص ڈھونڈیں اوران کا علاج سوچیں۔

موجودہ طرز مضمون نویسی میں نقائص:

ا۔ سب سے بڑا بنیادی اور اصولی نقص یہ ہے کہ ہم استاد سخت نالائق ہیں۔ انشا پردازی کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں۔ بہترین الفاظ و بلند تخیل، ہمارے اساتذہ ان دونوں چیزوں سے تقریباً ۹۹ فی صد یگانہ واقع ہوئے ہیں۔ سکولوں میں پھر کر دیکھیے۔ سلیبس ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے پہلے آپ کی نظر ''وقت کی پابندی'' پھر ''ڈاک خانہ کے فوائد'' اس کے بعد ''ریل گاڑی'' پر پڑے گی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا احمق ہے جو ڈاک خانہ اور ریل گاڑی پر کم از کم چار گھنٹے تک نہ بول سکتا ہو۔ ایک زمیندار کو لیجئے وہ ان مضامین پر سلاست اور بلاغت کے دریا بہا کر رکھ دے گا۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ ایسے مضامین سے طلبہ کے معیارِ ادب و تخیل میں کیا بلندی آسکتی ہے۔ مجھے معاف کیجئے گا اگر میں کہہ دوں کہ یہی وہ مضامین ہیں جنھوں نے ہماری فطرتوں کو غلیظ، طبیعتوں کو پست اور دقیانوسیت پسند بنا رکھا ہے۔ کیا ہمارے خطوط میں اب تک ''وہ خیر خیریت ہے، خیر، خیریت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ نہیں پایا جاتا۔

آخر استادوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ دنیا میں انھیں کوئی اور موضوع مضامین کے لیے نہیں ملتا۔ صبح اٹھیے، مشرقی فلک بوس پہاڑوں پر نگاہ ڈالیے سنہری صبح کہساروں کی شبنم پر محوِ خرام نظر آئے گی۔ چشمے ابلتے دکھائی دیں گے۔ چھوٹی چھوٹی

چڑیاں رسیلے ومیٹھے گیت گاتے نظر آئیں گی۔ کیا مضامین کے لیے یہ موزوں موضوع نہیں۔ اچھا نہ سہی، ساون کی گھٹاؤں میں بگلوں کی قطاریں، آبشاروں کی جوانیاں، دریاؤں کی طغیانیاں، پہاڑوں پر جنگلوں میں ہریاولیں، ساحلوں پر ندیوں کے کنارے مخمور سبزے، کیا یہ قدرتی نیرنگیاں آپ کے مضامین کا موضوع نہیں بن سکتیں۔ نہ سہی۔ گھر پہ نگاہ ڈالیے، ایک ننھا سا دو سالہ بچہ، ماں کو گود میں ہُمک رہا ہے۔ ماں کی دوست نگاہیں بچے کے معصوم چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ جب وہ بولتا ہے ہزاروں سرشاریاں ماں کی رگوں میں موجیں لینے لگتی ہیں۔ یہ چھوٹا سا کھلونا، اس کی آرزوؤں کا مرکز، اُس کی امیدوں کی قرارگاہ ہے۔ آہ! کبھی آپ نے سوچا کہ جب بچہ سو جاتا ہے تو اُس تازگی کی کیا تشریح جو بچے کے پتلے پتلے پیارے ہونٹوں پر ناچ رہی ہے۔ اُس تبسّم کے کیا معنی ہیں جو اُس کے تمام اعضا سے برس رہا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر دفاتر لکھے جا سکتے ہیں۔

کیوں نہ وہ قوم شُستہ دماغ، بلند مذاق اور الوالعزم ہوگی کہ جس کی تربیت میں نیچر کو یوں جزوِ جان بنا دیا جائے۔ ورڈزورتھ بہت بڑا آدمی تھا۔ اس لیے اُس کی ٹریننگ کسی ماہرِ فطرت انسان کے ہاتھوں میں ہوئی اور نیچر آئینہ کی طرح ورڈزورتھ کے ہاتھوں میں دے دی گئی کہ وہ ہر چیز کو نیچر کے عدسہ سے دیکھتا ہے۔

ہمارے دیہاتی بچوں میں ہزاروں ملٹن، شیکسپیئر اور ورڈزورتھ پیدا ہوتے ہیں لیکن اُس پھول کی طرح جو کسی ریگستان کی تنہائیوں میں کھلے اور ویرانوں کی وسعت میں اپنی خوشبو کھو کر مرجھا جائے۔ ہمارے بچے جہالت اور غلط تربیت کے پردوں میں دب کر زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ سوئی ہوئی بستیوں کو ہم

جگائیں۔ آنے والی نسلوں کو سنواریں سب سے اہم اور ضروری یہ ہے۔ کہ خود جاگیں اور خود سنوریں۔ ان چند الفاظ کے بعد میں کچھ تجاویز پیش کروں گا۔ کہ جن پر چل کر بچوں کی انشا پردازی تباہی سے بچ سکتی ہے۔ چونکہ الفاظ و تخیل انشاء کے دو ضروری اجزاء ہیں۔ اس لیے دونوں پر مفصل و الگ الگ بحث کی جائے گی۔

حسن الفاظ:

ا۔ للفاظ کی بلندی اُستاد کی قابلیت پر منحصر ہے۔ استاد نا قابل ہو تو طلبہ کا معیار تحریر بلند ہونا از بس دشوار ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ مشہور مصنفین اور اردو کے معتبر ماہانہ رسائل کا مطالعہ کریں۔ تا کہ انھیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو ارتقا کے کتنے مدارج سے گذر رہی ہے۔ آپ شاید اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ہر ۲۵ سال کے بعد ہماری زبان بدل جاتی ہے۔

جو زبان کہ فسانۂ آزاد کے لیے طغرائے امتیاز تھی، زمانہ اسے بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ مولوی نذیر احمد جیسے تقریباً ماڈرن مصنف کی اردو کسی قدر قدیم ہو رہی ہے۔ ساغؔر، جوشؔ، اخترؔ، فاخرؔ ہریانوی، حفیظؔ اور چند ایک اور نوجوانوں نے ایک ایسے چمن کی آبیاری شروع کر رکھی ہے۔ کہ جس کی دل فریبیاں یقیناً ان لالہ زاروں سے بیش از بیش ہیں۔ کہ جن کی سیرابی محمد حسین آزاد جیسے ہشیار تخیل پسند نے آبِ حیات سے کی تھی۔ اگر میری یہ آواز خدانخواستہ قدامت پسند طبقہ کے گوش گذار ہو جائے تو وہ یقیناً اپنی صداہائے احتجاج سے گنبد خضرا میں تلاطم اٹھا دیں۔

اگر زبانیں بدل رہی ہیں۔ الفاظ بدل رہے ہیں زمانہ کا رنگ بدل رہا ہے تو

کیا مقام حیرت نہیں کہ استاد نہ بدلیں۔ جو رنگ دنیا میں لے کر آئے تھے۔ اسی پر قانع ہوں۔ جدتوں سے نا آشنا۔ ادبی نیرنگیوں سے ناواقف ہوں۔ آخر آپ انسان ہیں۔ انسان کا کام حرکت ہے۔ نہ کہ جمود، بقول کسے:

غش میں ہیں سکتے میں ہیں یا مبتلائے خواب ہیں
یا نصیبِ دشمناں یہ موت کے اسباب ہیں

تو جب تک استاد رفتارِ اردو، اور اسکی تمام کیفیات عروج وتنزل سے واقف نہ ہوں گے، طلبہ کا واقف ہونا مشکل ہے۔

۲۔ الفاظ کو بلند بنانے کے لیے عملی تجویز ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہر دوسرے روز چند خوبصورت الفاظ جن میں قدرے تخیل بھی ہو حل کر کے طلبہ کو کہے کہ فقرات میں استعمال کر کے لائیں۔ خود دیکھیے کہ استعمال غلط تو نہیں۔

۳۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی مضمون سے اچھے اچھے الفاظ چن کر فقرات بنانے کے لیے دیے جائیں۔ دوسرے روز طلبہ کو وہ مضمون سنا کر لکھوا دیا جائے۔ تا کہ طلبہ الفاظ کا صحیح استعمال اور تناسب بندش وغیرہ سے محظوظ ہوں۔ مثلاً یہ الفاظ آپ لکھواتے ہیں۔

(i) بادِ حوادث
(ii) نسیمِ سحر
(iii) سطحِ آب
(iv) تنہا خرام
(v) دامن

طلبہ یقیناً غیر موزوں اور کسی قدر بھدے فقرات بنا کر لائیں گے۔ آپ چند ضروری سوالات کے بعد مندرجہ ذیل یا اس کے مساوی کوئی فقرہ بنا کر لکھواتے ہیں تو طلبہ میں یقیناً ایک طرح کی روز افزوں ادبی رودوڑ جائے گی۔ فقرہ یہ ہے۔

''زندگی کا چراغ بادِ حوادث کے تھپیڑوں سے یوں گُل ہو جاتا ہے، جس طرح کہ نسیم سحر کے جھونکے سے سطح آب پر ایک تنہا خرام بلبلے کا دامن چاک ہو جاتا ہے۔''

اگر اسی طرح مشق جاری رہے تو میرا تجربہ بتلاتا ہے کہ ترقی یقینی ہے۔

ا۔ بلندی الفاظ کے لیے راشد الخیری کی مناسب تحریریں کلاس میں پڑھ پڑھ کر سنائی جائیں۔ اور جہاں کوئی عمدہ خیال یا فقرہ آ جائے فوراً نوٹ کرایا جائے۔

باقی رہا تخیل تو اس کے متعلق مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

(i) کوئی موضوع پیش کر کے اس پر تخیل تلاش کیا جائے مثلاً ''جوانی کالی رات ہے اور بڑھاپا صبح'' یہ فقرہ پیش کر کے طلبہ سے دلائل پوچھے جائیں۔ کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ۔ آخر میں آپ اپنی رائے دیں اور تمام خیالات لکھوا دیں۔

(ii) شروع میں طلبہ کو لکھنے کے لیے عام مضمون دیا جائے۔ مثلاً چاندنی رات بلبل یا کوئل، ساتھ ہی انھیں بتلایا جائے کہ اس مضمون پر فلاں کتاب یا رسالہ میں تحریریں موجود ہیں۔ طلبہ انھیں پڑھیں بدل بدل کر اپنے الفاظ اور خیالات میں لکھیں۔ آخر میں استاد کسی بہترین مصنف کے خیالات اس مضمون پر سنائے، یقیناً طلبہ کو فائدہ ہوگا۔

(iii) میں اسے نہایت ضروری اور از بس مفید سمجھتا ہوں کہ طلبہ کو بہترین خیالات خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں نوٹ کرائے جائیں۔ ہفتہ میں ایک دن

صرف اس کام کے لیے رکھا جائے۔ بطور مثال میں چند ایک وہ فقرات یہاں لکھتا ہوں۔ جو گذشتہ سال لالہ موسیٰ جے وی کلاس کو لکھوائے تھے۔

(۱) تو ملول نہ ہو یہ دیکھ کر کہ پھول کے پہلو میں کانٹا ہے۔ بلکہ خوش ہو کہ کانٹے کے پہلو میں پھول ہے۔

(۲) محبت کی داستان کوئی زبان نہیں سنا سکتی۔ یہ وہ افسانہ ہے جسے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں سنایا کرتی ہیں۔

(۳) تو میرے دل کی تنہائیوں میں یوں گھسا ہوا ہے۔ جس طرح کہ پچھلی رات کو ہوا میں شبنم چھپی ہوتی ہے۔

(۴) جب تو میرے سرہانے زلفیں کھول کر مسکراتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا پیاسے ریگستان میں بادل چمک رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

(۵) آپ ایک لفظ طلبہ کے سامنے ڈال دیجیے مثلاً گھٹائیں، چڑیاں، انھیں کہیں کہ اس پر بہترین اسم صفت چسپاں کریں۔ کوئی کالی گھٹائیں، کوئی گھنگور گھٹائیں۔ اسی طرح کوئی سفید چڑیاں۔ کوئی سیاہ چڑیاں کہے گا۔ لیکن اگر آپ انھیں سانولی گھٹائیں اور ابر رنگ چڑیاں جیسے خوبصورت الفاظ بتلائیں تو تخیل میں کس قدر حسین انقلابات نمودار ہوں گے۔ میں آپ کی تفریح طبع کے لیے چند ایسے انگریزی / اردو مرکبات ذیل میں درج کرتا ہوں۔ کہ جن میں نہ صرف الفاظ حسین اور نازک ہیں بلکہ وہاں تخیل کے کئی تخیل جمع ہوں گے۔

اردو	English
شباب میں ڈھلا ہوا ترنم	1. Dew pearled hills.

ساون کی معصوم فضائیں	2. Dewy wine
بہار کی دوشیزہ راتیں	3. Golden moon is walking on the dew of eastern hills.
اچھوتی شبنم بکھرا ہوا انداز	4. Baling air____ airy walk.

وغیرہ وغیرہ۔

حضرات یہ وہ طریقہ ہے کہ جس پر چل کر ۷۰ فی صد مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ورنیکلر ٹیچر ان ہدایات پر عمل پیرا ہوں تو ہماری انشا میں ایک زبردست انقلاب آسکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یقین ہے کہ ہماری کم ہمتیاں، کاہلیاں، اور کم کوشیاں ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیں گی۔

بہرحال میرا فرض کہنا تھا سو وہ ہو چکا۔

[مطبوعہ: ۱۹۔ ستمبر ۱۹۲۸ء]

☆☆☆

امیدوارانِ امتحان ایف اے کی اُردو

پنجاب پبلک سروس کمشن نے مختلف امتحان ہائے مقابلہ میں شامل ہونے والے امیدواران کے معیارِ علمی و دماغی پر ایک رپورٹ ۳۰۔اپریل کو شائع کی ہے۔ جس میں درج ہے کہ:

"امیدواران کے اردو پرچے از بس ناتسلی بخش تھے۔ ہجے غلط، واقعات غلط، خط خراب اور اندازِ تحریر از بس مایوس کن تھا۔" اس دفعہ مجھے بھی کچھ ایسے ہی امیدواران سے واسطہ پڑا۔ پرچۂ سوالات پچھلے سالوں سے آسان تھا لیکن اُمیدواران کا معیارِ تحریر و بیان بہت مایوس کن تھا۔ میں نے ۳۶۳ پرچے دیکھے جن میں سے صرف ۲۹ پرچے ایسے تھے کہ جنھیں قدرے تسلی بخش کہا جا سکتا ہے۔ باقی پرچوں میں مندرجہ ذیل نقائص بہت زیادہ تھے۔

(۱) امیدواروں میں عام مرض یہ ہے کہ وہ لاپرواہی سے لکھتے ہیں۔ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ ان کا لکھا ہوا کوئی پڑھ سکے گا یا نہیں۔ پھر اس بد خطی کا اثر ممتحن پر کیا پڑے گا۔ ضرورت ہے کہ ایک سرکلر کے ذریعہ تمام آئندہ امیدواروں کو ہدایت کی جائے کہ وہ خوشخط لکھنے کی کوشش کریں۔ طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بُرے خط سے وہ ممتحن کی عداوت خرید رہے ہیں اور اچھے خط سے وہ اسے دوست بنا رہے ہیں۔

(۲) بہت کم ایسے امیدوار دیکھے کہ جو کم گو و مختصر گو ہوں۔ تکرار مضامین و اعادۂ الفاظ کا مرض بہت عام ہے۔ مثلاً ایک امیدوار اس شعر

چڑھا بُھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر آپ ہیں گھاٹ کے اور نہ گھر کے

کا مطلب ان الفاظ میں لکھتا ہے:

''جوانی بڑی دیوانی ہے۔ یہ مثل عام مشہور ہے۔ اس وقت جوانی میں انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ جوانی میں آنکھیں بند کیے اندھا دھند چلا جارہا ہوتا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جوانی میں آگے گڑھا ہے اور ذرا سی غفلت سے اس میں جا گروں گا۔ وہ ہے کہ چلا جارہا ہے۔ اور بسا اوقات اس کی یہ معمولی سی غفلت بہت بڑے نقصان کا پس خیمہ ہوتی ہے۔ جب انسان اس حد سے پار ہو جاتا ہے۔ تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا سب سے سنہرا زمانہ یونہی رائے گاں چلا گیا۔ میں نے اس کا کچھ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس وقت اس سے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اور وہ دوسروں کو نصیحت کرتا ہے۔ کہ خبردار مجھے اس کا تلخ تجربہ ہے۔ مگر اسی طرح وہ جوان آدمی بھی بغیر کان دھرے اپنے میں مست چلا جارہا ہوتا ہے۔ الخ۔۔۔۔۔۔

ملاحظہ کیا آپ نے۔ کہ بات کیا ہے اور کہہ کیا رہا ہے؟

(۳) لاپرواہی۔ امیدواران کے لاپرواہی کا یہ عالم ہے۔ کہ بعض نے سوالات تک کو غور سے نہیں پڑھا۔ مثلاً ایک امیدوار نے مضمون بجائے ''سائینس کی اہمیت'' کے ''سانس کی اہمیت'' پر لکھ مارا ہے۔ اور ۸ صفحے پھیپھڑوں کی بناوٹ اور دل کے عمل پر سیاہ کر ڈالے۔

مزید براں دوسرے سوال میں تشبیہ، محاورہ، استعارہ اور قافیہ کے الفاظ درج ہیں۔ پھر ستّر فیصدی امیدوار ''تشبیح'' لکھ رہے ہیں۔ بعض دیگر ''اشعارہ'' اور ''کافیہ''

لکھتے ہیں۔

(۴) معلوماتِ عامہ سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ بعض بزرگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اردو زبان نے کس ملک میں جنم لیا۔

ذرا مندرجہ ذیل نظریے ملاحظہ ہوں۔

(۱) اردو عربوں کی زبان ہے اور عرب میں بولی جاتی ہے۔

(۲) اردو پہلے مصر میں بولی جاتی تھی۔

(۳) اردو ایرین ایشیائے خورد سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

(۴) اردو افغانستان کی مادری زبان ہے۔

ان تمام نظریوں سے زیادہ دلچسپ ایک محقق کا مندرجہ ذیل انکشاف ہے۔فرماتے ہیں کہ:

پہلے پہل اردو فارسی زبان میں بولی جاتی تھی۔

دیوانِ حالی کس کی تصنیف ہے؟ ایک ریسرچ سکالر کا خیال ہے کہ "دیوانِ حالی کا مصنف شیخ سعدی ہے۔"

(۵) ہجے: مجھے شکایت نہ ہوتی اگر محض مشکل الفاظ کے ہجے غلط ہوتے قیامت تو یہ ہے کہ ۷۰ فیصدی طلبہ نے نہایت آسان اور کثیر الاستعمال الفاظ بُری طرح مسخ کیے ہیں۔

مندرجہ زیل جدول ملاحظہ ہو

مسخ شدہ لفظ	اصلی لفظ	مسخ شدہ لفظ	اصلی لفظ	مسخ شدہ لفظ	اصلی لفظ
فاعدہ	فائدہ	موجودا	موجودہ	معبوب	محبوب

قائدہ	قاعدہ	ہمارہ	ہمارا	مقسد	مقصد
آپنی	اپنی	ہنا	حنا	جہیج	جہیز
ناکس	ناقص	جہایت	جہالت	عسق	عشق
بیتر	بہتر	ضرائع	ذرائع	صدما	صدمہ
		ذراعائے			
خواہیش	خواہش	زرائع	ذرائع	ورک	ورق
سیدہ	سیدھا	مبینت	محنت	بماری	بیماری
تہ	طے	مشرہ۔مصرا	مصرع	نگاؤں	نگاہوں
ہالات	حالات	بحرکیف	بہر۔۔	توجع	توجہ
فرمایہ	فرمایا	تنازہ	تنازع	کینا	کہنا
بول بھالا	بول بالا	ذلیل وخار	خوار	پاغل	پاگل
ڈونڈنا	ڈھونڈنا	تہ وبالہ	بالا	محمد عنور	انور
دکھیل	دھکیل	بھگولہ	بگولا	بھولنا	بولنا
مہشور	مشہور	چمک تاہے	چمکتا ہے	چھبانا	چبانا
ثابوت	ثبوت	علان	اعلان	اِعلاوہ	علاوہ
فتع	فتح	ڈھیرہ	ڈیرہ	اِعلامت	عِلامت
آنے والہ	لا	معملات	معاملات	وضول	فضول
مسلا۔مصلا	مسئلہ	شخش	شخص	تیرہ خیال	تیرا
معادہ	معاہدہ	اوردو	اردو	ترقی زبان	ترکی
معتر	معطر	شاعیر	شاعر	احساص	س

رعیا	رہا	کائم	قائم	ہلکا	حلقہ
بائس	باعث	بلکل	بالکل	بالکہ	بلکہ
مرہلہ	مرحلہ	تشبی	تشبیہ	رجو	رجوع
صھولت	سہولت	استمیال	استعمال	وقیات	واقعات
نصیت	نصیحت	استمال	ـ”ـ	اردوں	اردو
ذرخیز	زرخیز	شیرت	سیرت	دوزغ	دوزخ
شاہد	شاید	برغلاف	برخلاف	رتبا	رتبہ
فزا	فضا	کھالی	خالی	چھپ چاپ	چپ چاپ
ادھرنذرکر۔	۔نظر۔۔	طرقی	ترقی	حتک	ہتک
دادہ	دادا	ساف	صاف	طلوار	تلوار
شادھی	شادی	اضافع	اضافہ	رواض	رواج

وغیرہ وغیرہ۔

(۶) عام وسادہ لفظ کا غلط استعمال۔ مثلاً

(الف) ”نے“ کا استعمال

”شاعر نے واقعی کیا خوب کہتا ہے۔“

”اب دیکھو کہ وہ لڑکا نے اپنے باپ کا حکم نہ مانا۔“

(ب) ”ان کو“ کے بجائے ”انھوں کو۔“

اریرین ایشیا سے ہند میں آئے۔ کیونکہ انھوں کو وہاں اچھی گھاس نہ ملتی تھی۔“

(ج) ''کہ'' و ''کے'' میں کوئی تمیز نہیں رکھی گئی۔ مثلاً

''اس میں شک نہیں کے۔۔۔۔۔۔۔''

''بڑے غور کہ بعد۔۔۔۔۔

(د) ''ہو'' و ''ہوں'' کا غلط استعمال، ایک فاضل امیدوار کا فقرہ ملاحظہ ہو۔

۔ اردو کو ملکی زبان بنانے کے لیے ایک یہ تجویز پیش فرماتے ہیں کہ ''تمام کتابیں کالجوں کی اور سب سکولوں اور مضمون وغیرہ اور لا (law) وغیرہ کی کتابیں ہتکہ (حتٰی کہ) تمام دفتروں، کارخانوں اور انگریزی وغیرہ کی جو کتابیں ہیں۔ وہ اردو میں ہوں جائیں۔''

(ہ) ایک صاحب ''جو'' کا یوں خانہ خراب کرتے ہیں کہ ''کیا شادی نوجوان کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے'' اس مضمون میں یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں۔

''جو اگر اس نوجوان کی شادی جو اپنے معشوق سے ہونی ہے۔ جو انپر وہ خراب بدمزایا جو اوپر بیان کی ہوئی ہے۔ نہ ہوتیں۔ پھر جو اس کے مقابلے میں وہ جو ایک اچھی زندگی صرف کرنے۔ اولاد جو ہوتی وہ بھی توانا ہوتی، پھر جو اس کا جولڑکا ہوتا۔ پھر وہ مٹنے کا کبھی بھی نام نہیں لیتا۔''

(و) کئی امیدواروں نے اشعار کا مطلب لکھتے وقت لکھا۔

''اس بیت میں شعر (شاعر) کہتا ہے۔''

(۷) قوت ایجاد: بعض امیدواروں نے نئے نئے الفاظ ایجاد کر کے اردو ادب

پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(الف) ''اگر ایک گریجویٹ کو جاہل بیوی مل جائے تو شادی کا تمام مزا غل ہو جاتا ہے۔''

یہ ''غُل'' کہاں کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ کیا ہے۔؟ بغیر اللہ اور اس امیدوار کے اور کسی کو علم نہیں۔

(ب) ''اگر ایک نوجوان کو اپنی مرضی کے برخلاف شادی کراوٗ۔ تو وہ خودکشی کر کے 'راہ الموت کی راہ'' لے لیتا ہے۔

(ج) ''اردو کو پھیلانے کے لیے بڑے بڑے 'عالمدانوں'' (بروزن پاندانوں) کے لیکچر ہونے چاہئیں۔''

(د) ''اگر شادی اچھی نہ ہو تو پھر ہم چھڑے کے چھڑے اچھے ہیں۔''

(ہ) جس آدمی نے تجھ کو مانیا نہیں۔ تو اسنے تجھ کو جانیا ضرور ہے۔''

(و) قصیدہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک مدعو اور دوسرا جو۔''

(۸) اردو کے مختلف اقسام: ان پرچوں میں اردو کی مختلف قسمیں نگاہ سے گذریں:

(۱) ادبی اردو

(۲) گوراشاہی اردو

(۳) ادب لطیف

(۴) اردوئے مستقبل

(۱) ادبی اردو صرف ۱۰/۱۰۰ امیدواران نے استعمال کی۔ جن کا انداز تحریر کافی

پختہ تھا اوران کی قادرالکلامی پرشہادت دیتا تھا۔

(۲)　　گوراشاہی اردو۔صرف ۱۰۰/۵ امیدواروں نے استعمال کی۔ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

''عمل سے زندگی بنتی ہے۔۔۔۔ پرلکھتے ہوئے ایک صاحب فرماتے ہیں:

''مگر وہ جنت اس آدمی کے لیے ہے۔کہ نیک اعمال کرتا۔وہ وہ اسی دنیا میں بن سکتا۔جبکہ وہ اپنے گھر کا بادشاہ ہوتا۔اوراپنی اوراپنے بال بچوں کی زندگی کو نیک عمالات کا جامہ پہناتا۔تو کوئی شک والا بات نہیں کہ وہ بھی اس کو جنت میں نصیب ہوتا ہو۔''

(۳)　　ادب لطیف کے ایک شاہکار کالطف لیجئے۔

''ہندوستان جنت نشان'' پرلکھتے ہوئے ایک ٹیگورصاحب فرماتے ہیں۔

''جب شاہِ خاوراپنا رنگین جامہ زیب تن کر کے اپنی کھلی آنکھوں سے اس عالمِ فانی پرنظر کرتا ہے۔تو حسرت آبدوز ہو جاتی ہے۔لیکن ہندوستان اوجِ کمال پر اپنی بافرہی شان سے اپنی چھاتی پر بچوں کو لیے پڑا ہے۔اور کسی کو کیا مجال کہ اس پر ایک سرسری نظر بھی ڈال سکے۔ایک طرف دیوارِ کوہ موجزن ہے۔اور دوسری طرف بڑے بڑے کانگرس کے لیڈران، ماہران روحانی علم اس جگہ سے ہی ولادت ظہور پذیر ہوکر ہندوستان ایران کوکراچی تک نوربخشاں کرتے ہوئے ملک یعنی بھارت ماتا کے سرپراونچے ہوکر بلندیاں کررہے ہیں۔''

(۴) اُردوئے مستقبل: اگر پنجاب یونیورسٹی کے اربابِ بست وکشاد نے اُردوزبان کے متعلق پوری توجہ سے کام نہ لیااور دوسری طرف کانگریسی صوبوں کی سرکاری زبان

''ہندوستانی'' کی آندھیاں صحرائے اُردو میں آ پہنچیں تو اُردو کی طرف بے توجہی کا یہ عالم ہو جائے گا کہ ہمارے خاص طلبہ بھی اسی زبان میں لکھنے لگ جائیں گے کہ جس میں آج ایک کثیر تعداد لکھ رہی ہے۔ تقریباً ۲۰ فی صدی طلبہ نے مندرجہ ذیل زبان میں پرچے لکھے۔ گذشتہ سالوں میں یہ تعداد مشکل سے ۵ فیصد تھی۔ ملاحظہ ہوں چند نمونے:

(i) کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا

''اے خدا تیری موجود ہوتا ہر آدمی کو معلوم ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ تو موجود ان ہے۔ جو شخص تجھے مانتا نہیں۔ بھی بھری۔ اس کا کیا کہ اُس کو نہیں مانتا اور کیا کہ بتاؤ۔ کہ اور ظاہر کرو کہ وہ یا نہیں۔ کہ اس بات کا شک بھی ظاہر کرتا ہے وہ''

نمونہ (ii) عمل سے زندگی بنتی ہے۔۔۔۔۔ پر یوں فرماتے ہیں:

''کوئی جگہ اگر اپنے لیے تلاش کرنا ہو۔ وہ عمل سے پہلے واقف ہوں گے تب کوئی بات بننے کو ہو گی۔ وہ کیا وجہ ہے۔ جس کالج میں ہونے بھی عمل کی طرف متوجہ نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں جائیں خواری ہوتی ہے، کیوں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ یہی ہے۔ ہر ایک طالب العلم ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے اور ہوتا ہے۔ کہ اگر عمل بد ہے تو ہر ایک اس سے یہ خواہش کرتا ہے کہ اسے بچوں۔ کہ یہ ضرور ہے۔ خواہ آدمی اُس کے سامنے نہ کہے۔ بعد میں بھی اس پر بہت کُچھ کہتا ہے۔''

(یہ فاضل اسی طوفانی انداز کے ساتھ پورے آٹھ صفحے لکھ جاتا ہے)

نمونہ (iii) مضمون ''شادی''۔

''شادی مرضی سے کرنا کرانا ایک بڑا بے ڈنگی سا سوال ہے۔ شادی نہ کرانے کا کرانے کا سوال اس طرح پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں

والوں کے والدین ان کو بڑی آرایش کی زندگی میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کے دلوں میں فیشن کا مادہ بھر دیتے ہیں۔ اور دوسرا انکو بڑی بڑی تعلیمیں دے کر لڑکوں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ کاروبار میں کام کرنے کے لیے بنا دیتیں ہیں۔''

نمونہ (iv) ''نوکر کہتا ہے بی بی جی بڑی بے رحمدل ہیں۔ اگر گلدستے میں پھول لگے ہوئے ہوں۔ تو وہ کیا سارے خوبصورت نہیں ہوتے۔ بلکہ اچھے اور گنڈے دونوں قسموں کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لڑکیاں بھی اچھی بھی اور بُری بھی ہوتی ہیں۔''

اگر ہماری بے حسّی اور بے توجہی کا یہی عالم رہا تو مستقبل قریب میں ہمارے نوجوان طلبہ کی ''سرکاری'' ادبی اور قومی زبان اسی قسم کی ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ لاہور میں ایک اردو مرکز قائم کیا جائے۔ جس کا مقصد محض حکومت و یونیورسٹی پر دباؤ ڈال کر اردو کی اہمیت و وقار کو بڑھانا ہو۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ کہ اردو کو درسگاہوں میں لازمی زبان کر دیا جائے۔''

کیا محترم مدیر 'ہمایوں' کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لاہور میں ایک ایسی جماعت قائم کرسکیں۔ کہ جو بذریعہ مقالات و تقاریر اردو کی موجودہ زبوں حالی کی طرف حکومت و جامعہ کو اتنی دفعہ متوجہ کرے۔ کہ ان کے نواہائے تلخ سے خوابیدہ غنچے جاگ اٹھیں۔ اور حکومت میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی زبان کی سرپرستی کے بغیر اپنی تہذیب وتمدن کے آثار کو رنگ دوام نہیں دے سکتی۔

(۹) یہاں تک تو اِن ''قوم کی امیدوں'' کے نمونہ ہائے نثر دیے گئے تھے اب ذرا دنیائے نظم میں اعجازِ نگارش ملاحظہ ہو:

ایک صاحب ''مرثیہ'' کی تعریف درج کرنے کے بعد مرزا غالبؔ کی

خدمت میں مندرجہ ذیل سلکِ لآلی پیش کرتے ہیں:

(۱) ہائے غالبؔ تو کب کا کدھر کو چلا گیا
دنیا سے کوچ کر کے ہمیں کر گیا پامال

(۲) اچھے بھی دیکھے تھے برے بھی سنے تھے بہت
لیکن تجھے عروج ہے اور اس کو ہے زوال

(۳) تجھسا مجھکو نہیں امید کوئی ہو سکے پیدا
شاعری تو درِ کنار نثر میں دکھایا یا کمال

(۱۰) چند لطائف:

(۱) ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ایک شاعر، نقاش، بت تراش اور ادیب کی اپنی بیوی سے کبھی نبھ نہیں سکتی۔ اس لیے کہ یہ لوگ جدّت پسند ہوتے ہیں۔ اور بیوی چند دنوں کے بعد پرانی ہو جاتی ہے۔

(۲) ایک صاحب مجنوں کو یوں تنبیہ کرتے ہیں:

پلپلا کر دیتا جوتوں سے تیرے سر کو ضرور
شکر کر مجنوں! کہ لیلیٰ کا کوئی بھائی نہ تھا

(۳) موجودہ حکومتِ پنجاب پر ایک صاحب طنزاً لکھتے ہیں۔

برٹش کی گود میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں
ہے ڈیڑھ فٹ کا طرّہ قومی نشاں ہمارا

معذرت:

میں نے جناب کا کافی وقت ضائع کیا لیکن :

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

امید ہے کہ آپ کوئی نہ کوئی ایسا قدم ضرور اٹھائیں گے۔ کہ جس سے آج نہیں تو کچھ عرصہ کے بعد ہم اردو کو دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہمدوش دیکھ سکیں۔

[مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور: بابت اگست ۱۹۳۹ء]

☆☆☆

گاندھی جی اور عدم تشدد

کچھ عرصہ ہوا، مہاتما جی نے اہل چین کو اور اس کے بعد اہل چیکوسلو یکیہ کو مشورہ دیا تھا۔ کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کی خاطر عدم تشدد کا حربہ استعمال کریں اور اب اہل ہند کو فرما رہے ہیں۔

''میرا محکم یقین ہے کہ دنیا میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو عدم تشدد میں مہارت حاصل کرسکتا ہے۔ اگر اب بھی اہل ہند کو کسی ابتلا میں ڈالا جائے، تو ہزار ہا مرد و زن مرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور ان کے دلوں میں حملہ آوروں کے خلاف ذرا سی کدورت تک نہیں پیدا ہوگی۔۔۔۔۔۔ آزاد ہندوستان کا کوئی دشمن نہیں ہوگا اور اگر آزاد ہندوستان پوری طرح عدم تشدد پر کاربند ہو جائے، تو اس پر قطعاً کوئی حملہ آور نہیں ہوگا۔۔۔۔ ہندوستان کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی عدم تشدد سے کرے، اگر اس ملک نے بھی عدم تشدد ترک کردیا۔ تو دنیا کی تمام امیدیں خاک میں مل جائے گی۔ (ہریجن ۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

یہ ہیں مہاتما جی کے ارشادات:

اہل چین نے ان ارشادات پر توجہ نہ کی، اس لیے زندگی کی امید بدستور ان میں باقی ہے۔ اہل چیکوسلو یکیہ نے عملاً عدم تشدد کیا، اور وہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔ اب ہندوستان کو یہ سبق دیا جارہا ہے۔

سر سکندر نے نیاز بیگ کی زمیندارہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ اگر کوئی قوم ۔۔شمال مغرب سے حملہ آور ہوئی تو اہل پنجاب تمام کٹ کر مٹ

جائیں گے اور دہلی میں سفید جھنڈیوں سے حملہ آوروں کا استقبال ہوگا۔ وزیرِ اعظم کے یہ ارشادات حرف بحرف درست ہیں۔ جس قوم نے گذشتہ دو ہزار سال سے تلوار کو چھوا تک نہ ہو۔ جس کی رگ رگ میں بزدلی خوفِ مرگ سرایت کر گئے ہوں۔ جو قوم دھن کی پجاری ہو، جس کے جذبۂ حمیت و شجاعت کو دال اور ساگ پات نے کچل کر رکھ دیا ہو۔ اور پندرہ سو سالہ غلامی نے جن لوگوں کے دست و پا کو مفلوج کر دیا ہو، ایسی قوم سے ہم کسی بہتر سیاست کی امید ہی نہیں رکھ سکتے۔

سیاست ہند کی دو شخصیتیں:

مسلمانوں کو جذبۂ ایثار و جہاد سے بیگانہ کرنے کے لیے سب سے پہلا قدم مرزا غلام احمد قادیانی نے اٹھایا، آپ نے مسلمانوں کو نہ صرف ترک جہاد کا حکم دیا، بلکہ جہاد کو حرام قرار دیا:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے!
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ حرام ہے

مرزا صاحب کے رخصت ہوتے ہی گاندھی صاحب نے سیاسیات ہند کی سٹیج پر قدم رکھا آزادی ہند کا چکمہ دے کر کچھ مسلمانوں کو ساتھ ملا لیا۔ اور ان کی محبوب ترین متاع یعنی اصول جہاد پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔

تمام ہندوستان میں اہل سرحد جنگجوئی، شجاعت اور سرفروشی کے لیے مشہور

تھے، اس لیے آپ نے سرحد میں متواتر دورے کیے، ہفتوں وہاں رہ کر پٹھانوں کو بزدلی، بے حمیتی، اور نکما پن کا درس دیا، اور وہاں ایک چیلا (سرحدی گاندھی) پیدا کیا۔ جو مہاشوں کی طرح برہنہ سر پھرتا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہتا ہے۔ داروہا میں جا کر بندے ماترم کا گیت گاتا ہے۔ اور تمام علاقے میں پھر پھر کر پٹھانوں کو ان کے جوہر آبائی سے محروم کر رہا ہے۔

لیکن:

یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ عدم تشدد کا یہ رہنما اپنے چیلوں کی طرف کیوں ملتفت نہیں ہوتا۔ جب وہ یو۔ پی میں نہایت سفاکانہ طریقے سے خاکساروں پر لاٹھیاں برساتے ہیں۔ انھیں گولیوں سے خاک وخون میں تڑپاتے ہیں، جیلوں میں ستر ستر گھنٹے بھوکا رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا یہ عدم تشدد کے وعظ صرف اس لیے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو سلا دیا جائے۔ اور ہندو کو جگا کر اہلِ توحید پر مسلط کر دیا جائے؟

کانگرسی مسلمانوں سے خطاب!

ایک طرف قرآن حکیم کی مکمل وغیر متبدل تعلیم ہے جو مسلمانوں کو سرفروشی، قصاص، شجاعت، اور جانبازی کی تعلیم دے رہی ہے۔ صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اسلاف کرام کی سپاہیانہ زندگی کا نمونہ ہے۔ عمرؓ، علیؓ، حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ۔۔۔ اور دیگر ہزارہا جانفروشان اسلام کا عمل ہے۔ اور دوسری طرف ایک غلام دھوتی پوش مار کھانے کا درس دے کر تمہیں نامرد، تمہاری فطرتوں کو ذلیل اور تمہیں ایک اچھا خاصہ گوسفند بنا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم کدھر جاؤ گے۔ اللہ کی طرف یا اس ہندوستانی بت تراش اور بت پرست کی طرف، کانوں کو کھولو، اور سنو کہ عرش کی بلندیوں سے بدستور

ایک صدا آ رہی ہے۔

قل تعالوا الی الرسول لما یحییکم

(آؤ رسولِ عربی کی طرف، کہ جو تمہیں درسِ حیات دے رہا ہے۔)

کانگرس کے مقاصد:

اس جماعت کے مقاصد دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکے ہیں، ان کا مقصد مسلمانوں کو بزدل بنانا۔ مسلمانوں کی تہذیب کو ختم کرنا۔ مجاہدین سلف کے کارناموں سے انھیں غافل بنانا۔ ''السلام علیکم'' کے بجائے۔ نمسکار جاری کرنا، بندے ماترم کے گیت سکھلانا، شلوار اتار کر دھوتی پہنانا۔ سر سے رومی ٹوپی اتار کر گاندھی ٹوپی کو رواج دینا۔ اگر ممکن ہو، تو چوٹی بھی سر پر رکھوانا۔ اور اردو کو مٹا دینا ہے۔

۱۶۔ اکتوبر کا ذکر ہے کہ بنارس میں آل انڈیا ہندی لٹریری کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس کے صدر پنڈت امیکا پرشاد نے اعلان کیا:

''صرف ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے۔''

اس انجمن میں بابو راجندر اپرشاد صدر کانگریس، مسٹر ٹانڈن صدر مجلسِ مقننہ موجود تھے۔ اس کانفرنس کی حوصلہ افزائی کے لیے گاندھی، جواہر لال نہرو، پنڈت پنت، مسٹر بی۔ جی سکھیر ا، سر چنتامنی وغیرہ نے پیغامات تہنیت بھیجے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی اردو کانفرنس میں بھی آج تک ان قومیتِ متحدہ کے علمبرداروں نے کوئی پیام حوصلہ افزائی یا تہنیت بھیجا؟ کبھی نہیں بھیجا اور نہ آئندہ بھی بھیجیں گے۔ یہ واقعات بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں۔ کہ کانگرس ہائی کمانڈ

مسلمانوں اوران کی تہذیب، تمدن وزبان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہوئی ہے۔اور صرف یہی نصب العین ہے کانگرس کا۔

کانگرس اور خاکسار:

حال ہی میں حافظ محمد ابراہیم نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے۔مجلس مقنّنہ کے بھرے اجلاس میں کہا" کہ ہم خاکساروں پر اس سے زیادہ سختیاں کریں گے۔" (احسان اخبار مورخہ ۱۷۔اکتوبر ۳۹ء) کیوں صاحب! آپ کا خاکساروں نے کیا بگاڑا ہے؟ یہی نا۔کہ آپ اور آپ کے پیرومرشد مسلمانوں کی تنظیم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ورنہ خاکساروں جیسی کئی اورفوجی تنظیمیں آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ ان پر آپ کیوں ملتفت نہ ہوئے۔مثلاً مہابیر دل، بجرانگ سیوک اکھاڑہ، شکتی دل، اکالی دل، اکالی سینا، جین اکھاڑہ وغیرہ کیا خاکساروں کا صرف یہی گناہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔بس؟تم لوگوں کو اپنے کرتوتوں پر شرم آنی چاہیے۔

یاد رکھو۔کہ تمہارا یہ وتیرہ تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔تمہاری اس مکروہ حکمت عملی، غلیظ ذہنیت، زہریلی فطرت، مسلم کش پالیسی، اور خانہ برانداز حرکات کی وجہ سے ہندوستان دو بڑے بڑے گروہوں میں بٹ چکا ہے۔تم آنے والی تباہیوں کی بنیاد رکھ رہے ہو۔تم ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا ارادہ رکھتے ہو۔

[مطبوعہ: روزنامہ احسان۔لاہور بابت: ۱۹۳۹ء]

☆☆☆

مہاتما گاندھی کا نیا فلسفہ

مہاتما گاندھی ہندوستان کے گرگٹ اعظم ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے، کہ مسٹر جناح کی تعریف کر رہے تھے۔ اور مسلم لیگ کو ہندوستان کی ایک با اقتدار جماعت کہہ رہے تھے۔ لیکن ۲۱۔ اکتوبر کے ہریجن میں ایک نیا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ ہم اس مقالے کے بعض اقتباسات مطالعۂ ناظرین کی خاطر درج کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

''میں کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کہتا ہوں، اور اس بنا پر بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہیں۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ کانگرس تمام ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑ رہی ہے۔ اس لیے اسے ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کہنا بجا ہے۔''

اس بیان میں ایک بنیادی و اصولی غلط بیانی ہے۔

کانگرس صرف اونچی جاتی والی ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی خاطر لڑ رہی ہے۔ نہ کہ تمام ہندوستان کے لیے۔ ہندوستان میں سات کروڑ اچھوت اور نو کروڑ مسلمان بھی رہتے ہیں، جنھیں آپ پر قطعاً اعتماد نہیں۔ اچھوت آپ کی حکومت کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ ان کی موجودہ تباہی اور ویرانی برہمنوں کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان کشمیر میں آپ کے ہتھکنڈے دیکھ چکے ہیں۔ اور گذشتہ اڑھائی سال میں مسلمانوں کی تہذیب کو ذبح کرنے کے لیے جو کچھ آپ نے کیا۔ اور بدستور کر رہے ہیں۔ وہ

ہمارے سامنے ہے۔ ان واقعات کی موجودگی میں یہ امید رکھنا کہ مسلمان و دیگر اقلیتیں ایک دفعہ اور آپ کے جنونِ مذہبی کا شکار ہو جائیں گی۔ قطعاً غلط ہے۔

علاوہ ازیں کانگرس کو یہ کیسے دھوکا لگ گیا ہے کہ وہ خود ہی آزادی ہند کی واحد علمبردار ہے۔ مسلمانوں نے آزادی ہند کی خاطر بے شمار قربانیاں دیں۔ اور آئندہ بھی وہ دیں گے۔ لیکن اگر ہم سے یہ توقع رکھیں کہ ہم رام راج کی خاطر کوئی مزید قربانی دیں گے۔ تو اس خیالِ باطل کو دل سے نکال دیں۔ مسلمان جاگ اٹھا ہے۔ اور اسے کوئی فسوں دوبارہ نہیں سلا سکتا۔

(۲) ''برطانیہ نے اب تک ہندوستان کو قید غلامی میں رکھا۔ اور دنیا کو کہا کہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو انگریز کی حکومت کو یہاں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مختلف گروہوں میں توازن باقی رہے۔ برطانیہ کے لیے بہتر یہی ہے۔ کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ اور ہندوستانیوں کو اپنی حکومت خود وضع کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔'' (گاندھی)

ہاں ایسے لوگ ہندوستان میں موجود ہیں اور اُس وقت تک رہیں گے جب تک آپ کا دماغ درست نہ ہو۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک دفعہ اور اچھوت کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اس لیے ڈالا جائے کہ وید کے اشلوک اس کے کانوں تک پہنچ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی حکومت مسلمانوں کے مذہب، روایات، تہذیب اور زبان کو مٹا کر رکھ دے اور وہ دیکھتے رہیں۔ آگے چل کر مہاتما جی فرماتے ہیں:

(۳) ''برطانیہ کی یہ پالیسی ہو چکی ہے۔ کہ وہ ہر ایسے گروہ کا وجود تسلیم کر لیتی ہے۔ کہ جو شور مچانا شروع کر دے۔ اور تکلیف دہ ثابت ہو۔''

اجی مہاتما صاحب! کانگرس کا وجود بھی تو اس لیے تسلیم کیا گیا۔ کہ وہ تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ اور شور مچاتی تھی۔ کیا شور مچانا اور کائیں کائیں کرنا آپ ہی کا فطری حق ہے۔ اور اگر کوئی اور گروہ آپ کی جفا کاریوں سے تنگ آ کر شور مچائے تو کیا اس کا گلا گھونٹ دیا جائے؟

ہندوستان کا یہ واحد نمائندہ غرور نمائندگی میں کہتا ہے:

(۴) کانگرس کو بھی مجبوراً ان مختلف گروہوں سے واسطہ پڑتا رہا۔"

بدیگر الفاظ یہ مسلم اس قابل تو نہ تھے کہ ان کے واویلا کی طرف توجہ کی جاتی۔ لیکن بعض اوقات کانگرس کو مجبوراً توجہ دینا پڑی، نخوت وغرور کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان کی بیس کروڑ اقلیتوں کی طرف نگاہ اٹھانے تک کی فرصت نہیں۔ اگر کبھی توجہ فرمائی بھی تو بہ ہزار مجبوری۔ اجی مہاتما صاحب! مسلمانوں ودیگر اقلیتوں کی بداعتمادی کی یہی وجہ ہے کہ ممکن ہے کہ آپ کو حکومت مل جائے۔ اور مہاشے ہماری تہذیب کی بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں۔ اور آپ کو مجبوریوں کی وجہ سے ادھر توجہ کرنے کی فرصت بھی نصیب نہیں۔

تجاہل کی انتہا ملاحظہ ہو:

(۵) "دراصل ہندوستان میں کوئی اکثریت واقلیت موجود نہیں۔ اور اکثریت کے مظالم کی داستانیں محض فرضی افسانے ہیں۔

دراصل مہاتما صاحب سترے بہترے ہو چکے ہیں۔ حواس انھیں جواب دے چکے ہیں۔ ورنہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے وجود کا انکار کرنا چہ معنی دارد۔ آپ کل ہی تو فرما رہے تھے۔ کہ مسلم لیگ ایک بڑی بااقتدار جماعت ہے۔ اور آج کہتے

ہیں، کہ اقلیتیں ہندوستان میں موجود ہی نہیں ۔ واہ چہ خوب۔۔۔۔۔

ذرا آگے چل کر آپ ہوش میں آجاتے ہیں۔اور فرماتے ہیں:

(۶) کہ جب آزاد ہندوستان آئین حکومت وضع کرنے لگے گا۔تو مسلمانوں و دیگر اقلیتوں کے تمام حقوق کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست ہوگا۔"

اجی واحد نمائندہ صاحب! جب ہندوستان میں کوئی اقلیت موجود ہی نہیں۔ تو آپ کن لوگوں کے حقوق کی حفاظت کریں گے؟ آپ کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ اور سوچے سمجھے بغیر بڑیں ہانک رہے ہیں۔

ایک اور سچائی کا اعتراف:

(۷) "اگر آج انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔تو پنجاب کے مسلمان و سکھ اور گورکھے ہندوستان پر حملہ کردیں گے۔ اور کانگرس جو تقریباً ہندو جماعت ہے۔عدم تشدد سے کام لے گی۔۔۔۔۔"

حقیقتاً مہاتما جی کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی فوجی تربیت وشجاعت سے ہے۔ انھیں پورا پورا احساس ہے کہ انگریز کے بعد مسلمان مہاشوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ اور اسی خطرہ کی بنا پر وہ ہمیشہ انگریز سے سودا کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ساتھ ہی کھلم کھلا تسلیم کرلیا۔ کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔اگر مسٹر جناح کانگرس کو ہندو جماعت کہہ دیں، تو تمام مہاشے شور سے سارا ہندوستان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔لیکن اگر مہاتما جی خود اس حقیقت کا اعتراف کرلیں۔تو یہی لوگ بھیگی بلی کی طرح خاموش رہتے ہیں۔

اس مقالہ کے آخر میں مہاتما جی بیدار مسلمانوں کو سلانے کے لیے ایک نئی قلابازی سے کام لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:

(۸) ''ہندو گو اکثریت میں ہیں۔ لیکن فوجی طور پر کمزور ہیں۔ لیکن مسلمان باوجود کم تعداد ہونے کے بہادر و طاقتور ہیں۔ اس لیے انھیں اکثریت سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ اکثریت کے مظالم اسی وقت تک ہیں۔ کہ جب تک انگریز ہندوستان میں موجود ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی مدد سے انگریزوں کو یہاں سے نکالا جائے۔ اور پھر پولیس اور فوج کی مدد سے مسلمانوں کو کچل دیا جائے۔ یہ ایک طرح کی شہ دی جا رہی ہے۔ کہ مسلمانو! تم بڑے بہادر لوگ ہو۔ ہم بنیوں سے کیوں ڈرتے ہو آؤ۔ انگریز کو نکال کر چین سے حکومت کریں۔ اسی میں آپ کا اور ہمارا بھلا ہے۔
جنابِ گاندھی جی! یہ آپ کی بھول ہے مسلمان اب آپ کے جھانسے میں نہیں آئے گا۔

[مطبوعہ: روزنامہ احسان۔ لاہور بابت: ۱۹۳۹ء]

☆☆☆

چند کڑوی لیکن سچی باتیں

گاندھی جی اپنے زعم میں انگریز تک کو اپنا محکوم سمجھتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریز کی تجارت ہندو کے دم سے باقی ہے پھر آٹھ صوبوں پر برہمن راج قائم ہے عوام میں کانگریس کا بڑا اثر و رسوخ ہے۔ اس لیے گاندھی جی کی ہر آ گیا کے سامنے انگریز کو جھکنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں کانگریسی حکومتیں مسلمانوں سے ازبس ظالمانہ، بے رحمانہ و قاہرانہ برتاؤ کر رہی تھیں۔ مسلم پریس کا گلا گھونٹنا۔ قربانیاں بند کرنا۔ بندے ماترم کو قومی گیت قرار دینا۔ ہر درسگاہ میں گاندھی کی تصویر آویزاں کر کے اس کی پرستش کرانا۔ ودیا مندر کا زہر مسلم کے رگ و پے میں داخل کرنا اور اردو جیسی سلیس، لطیف، ہمہ گیر اور لچکدار زبان کو مٹا کر گھسیاروں کی بولی کو ملکی، علمی اور دفتری زبان بنانا۔ کانگریس کے وہ شاندار کارنامے ہیں۔ کہ جب تک لیل و نہار کا سلسلہ باقی ہے مسلمانوں کو کبھی نہیں بھولیں گے۔

یہ سب کچھ کانگریس اس لیے کر رہی تھی کہ مسلمانوں کی قوت کا شیرازہ بکھر جائے وہ اقتصادی، مجلسی، مذہبی و اخلاقی طور پر اس قدر ذلیل کر دیے جائیں کہ عام مسلمانانِ کشمیر کی طرح ان میں احساسِ ذلت تک باقی نہ رہے۔ وہ اچھوتوں کی طرح ذلّ و مسکنت اور بے کسی اور بے چارگی کے پتلے بن کر صرف ہندو کے رحم پر جئیں۔ ان کی آواز میں اثر نہ رہے۔ فغاں نارسا بن جائے۔ اگر مسلم کسی وقت احساسِ ظلم سے روئے تو کہا جائے کہ صورت ہی رونی ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر کانگرسیوں نے مسلمانوں کو اچھی طرح رگیدا۔ اب گاندھی جی کو تقریباً یقین ہو چکا تھا۔

اگر جنگ یورپ کی الجھنوں سے فائدہ اٹھا کر سواراج طلب کیا گیا تو وہ فوراً مل جائے گا۔ بس اس کے بعد پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہیں۔ پنتھ صاحب کی گولیاں ہوں گی اور خاکساروں کی چھاتیاں۔ ہندی کا جوتا ہوگا اور اردو کا سر۔ ودیا مندر کا زہر ہلاہل ہوگا اور مسلمانوں کے نونہال۔ متعصب، تنگ نظر و کینہ پرور برہمن کا فولادی پنجہ ہوگا اور اہل توحید کا گلا۔ دل کھول کر اورنگزیبی مظالم کے بدلے لیں گے۔ اور ہزار سال کی دبی ہوئی آتش بغض وعداوت کو آبِ انتقام سے بجھائیں گے۔

مسٹر جناح کی دوربین نگاہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ آپ نے وائسرائے سے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمان ہندو کے خوفناک ارادوں سے آگاہ ہے۔ اگر ہندو کو ہم سے پوچھے بغیر کچھ دے دیا گیا تو ہم ایسے آئین کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ وائسرائے نے گاندھی جی سے صاف صاف کہہ دیا کہ جاؤ اور پہلے اقلیتوں کو مطمئن کرو۔ گاندھی جی کے غرورِ نمائندگی پر وائسرائے کے جواب سے ایک مہلک زد پڑی۔ آپ چکرا گئے اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی کٹیا کو چل دیے۔

اب گاندھی جی نے سوچا کہ انگریز بگڑ گیا ہے۔ سواراج دینے کا نہیں اور پھر ہندوستان کے پچیس کروڑ دھوتی پرشادوں میں قربانی کا مادہ نہیں۔ جان لڑانے کی ہمت نہیں۔ مال کی پوجا کرتے ہیں۔ موت سے ڈرتے ہیں۔ اگر کسی طرح بے وقوف مسلمانوں کو ہم دوبارہ گھیر گھار کر ساتھ ملا لیں۔ اور آزادیِ ہند کے نام پر اسے مشتعل کر دیں۔ تو گولیوں کا شکار یہ ہوگا۔ جیلوں میں یہ سڑے گا۔ پھانسی کے تختے پر یہ چڑھے گا اور بعد میں شور شار مچا کر سواراج ہم لے لیں گے۔ اس تجویز کو رنگ عمل دینے سے پہلے نہرو صاحب نے ایک بیان شائع کیا۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

''ہم صرف ایسی حکومت چاہتے ہیں جس پر اقلیتیں پوری طرح سے رضا مند ہوں''۔اس کے بعد گاندھی جی نے مسٹر جناح پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے اور بابو راجن و پنڈت نہرو نے بڑے بڑے منتر پھونکے لیکن وہ گاندھی جی کے قابو نہ آیا۔ کوشش بدستور جاری ہے۔نہرو جی عنقریب جناح صاحب سے دوبارہ ملنے والے ہیں اور گاندھی جی تمام نفسیاتی و دیگر حربے استعمال کر رہے ہیں۔مثلاً

حربہ اوّل:

کانگریس کے ہٹلروں نے گذشتہ تین سال میں بُھول کر بھی ہندو مسلم اتحاد کا نام نہ لیا تھا۔لیکن وائسرائے کے اعلان کے بعد ہر طرف سے اتحاد، اتحاد ہو رہی ہے۔ ''ہم صرف ایسی حکومت چاہتے ہیں جس پر اقلیتیں ہر طرح سے مطمئن ہوں۔'' آخر انقلاب کیوں؟ صرف مسلمانوں کو پھانسنے کے لیے۔اگر ایک دفعہ سواراج مل جائے تو اس کے بعد بقول فردوسی:

من و گذر و میداں و افراسیاب

لکھنؤ اور میرٹھ کی جیلوں سے رہا شدہ خاکسار بتلاتے ہیں کہ کئی جیلوں میں غیر مسلح کرنے کے بعد اس طرح پیٹا گیا کہ کئی اسیروں کے حواس ٹھکانے نہ رہے۔اور جب مار پیٹ کی وجہ پوچھی گئی تو کہا گیا کہ سرکار دولتِ ہند کا حکم ہے۔اور دوسری طرف خاکساروں کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کٹجو! وزیرِ انصاف یو۔پی ۲۷۔اکتوبر کو ایوان اسمبلی میں فرماتے ہیں۔

''ہمیں اس امر پر ناز ہے کہ ہماری حکومت نے شخصی آزادی کو قائم رکھنے

کے لیے وہ کچھ کیا کہ جس کی مثال کسی اور صوبے میں نہیں مل سکتی۔''

(ماشاءاللہ چشم بددور)۔ جوٹولی عدل وانصاف کے تخیل سے قطعاً واقف نہ ہو جس کا دل وحشت و بربریت کے بہیمانہ جذبات کا مسکن ہو۔ جس کی شہادت ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت زبان حال سے دے رہے ہوں۔ جن کا واحد نصب العین مسلمانوں کا استیصال ہو۔ اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ آزادی کے بعد ہم سے انصاف کرے گی۔ ابولہب سے اسلام کی توقع رکھنا ہے۔ یہ میری شخصی رائے نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے بغیر تمام مسلمانوں کی یہی رائے ہے۔ خود اللہ کا یہی فیصلہ ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوا

ترجمہ:۔ مسلمانوں کے قریب ترین دوست نصاریٰ ہی ہیں۔

ہندوؤں نے بارہا پیغمبرِ اسلام پر ناگفتہ بہ حملے کیے ہیں۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی ایک اعلیٰ مسلم عالم ہے جس نے ''تذکرہ'' میں رام کرشن کے ساتھ علیہ السلام کا کلمہ لگایا۔ ہندوؤں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو محمد ﷺ کو نبی یا رسول کہتا ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بغض رکھتا ہے۔

حربہ دوم:

ہندو پیسہ مانگتے وقت ہاتھ جوڑتا ہے۔ زاری کرتا ہے۔ اور خوشامد کی معجون مقوی کھلاتا ہے۔ لیکن مایوس ہونے کے بعد وہ اپنا غصہ، طعنہ دے کر نکال لیتا ہے۔ بڑا جنٹل مین بنا پھرتا ہے۔'' یہ کہہ کر کسی اور بابو کے پاس جاتا ہے۔ مہاتما جی یہ تمام گدا

گرانہ اصول استعمال فرما رہے ہیں۔ چند روز پہلے مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی بڑی تعریف کی کہ مسلم لیگ ایک مقتدر جماعت ہے اور جناح ایک بڑے رہنما۔ اور علمبردارِ آزادی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ جب مذاکرات صلح ناکام ہوئے تو طعنوں پر اتر آتے ہیں چنانچہ ''ہریجن'' ۴ نومبر کی اشاعت میں فرماتے ہیں۔

''جناب مسٹر جناح صاحب سے صلح مشکل ہے۔ اس لیے کہ وہ حفاظت حقوق کیلیے۔ انگریز کے دستِ نگر ہیں اور قدرتی طور پر مسٹر جناح کے مطالبات کانگریس کے سامنے ان مراعات سے بہت زیادہ ہیں جو انگریز مسلمانوں کو عطا کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

حربہ سوم:

گاندھی جی کے ایک چیلے مرار جی ڈیسائی بمبئی کے ایوان اسمبلی میں ۲۷۔ اکتوبر کو تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے تو میں نہایت مسرّت سے اس حکومت کو قبول کروں گا۔''

ڈیسائی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اس مجنونانہ بڑ کے جواب میں تمام ہندوستان کے مسلمان چلّا اٹھیں گے۔

''اجی ڈیسائی صاحب واللہ تکلف نہ فرمایئے۔ حکومت آپ ہی قائم فرمایئے۔ ہم غلامی کریں گے۔ توبہ توبہ آپ کیوں غلامی کریں نہ آپ کے باپ نے یہ کام کیا نہ آپ کے دادا نے۔''

حربہ چہارم:

جوں ہی سر سیموئل مور، لارڈ ٹیلنڈ اور وائسرائے نے گاندھی جی کو مسلمانوں کے حقوق کی طرف متوجہ کیا تو آپ کے تمام چیلے چانٹوں نے آسمان سر پر اٹھالیا کہ سرکار برطانیہ فرقہ وارانہ سوالات کو آزادی ہند کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ (ہریجن ۶۔نومبر نیز پٹنہ میں بابو راجن کی تقریر ۸۔نومبر ۳۹ء)

کیا ہم گاندھی جی سے پوچھ سکتے ہیں۔کہ یہ سوال کس کا پیدا کیا ہوا ہے؟ انگریز کا؟ مان لیان کہ انگریز نے یہ سوال پیدا کیا ہے تو آپ نے گذشتہ اڑھائی سال میں ہماری تالیف قلوب کے لیے کون سا قدم اٹھایا؟ انگریز نے تو اردو کو دفتری و تعلیمی زبان بنایا۔تم نے اڑھائی سال میں اس غریب کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔انگریز کے عہد میں خاکسار تحریک آزاد تھی۔تم نے اس پر پابندیاں عائد کیں۔اور جونہی ایوان حکومت سے تم لوگوں نے قدم باہر رکھا۔یہ پابندیاں پھر دور ہو گئیں۔انگریز کے زمانہ میں قربانی کی اجازت تھی۔تم نے بند کی۔انگریز کے عہد میں گاندھی جی کی تصویر سکولوں میں عبادت کے لیے آویزاں نہ تھی۔تم نے ہماری روایات کو کچلنے کے لیے ودیا مندر سکیم جاری کی۔کیا یہ سب کچھ تم لارڈ ٹیلنڈ کے حکم سے کر رہے تھے۔یا ہائی کمانڈ کے حکم سے۔

اگر تم نے یہ سب کچھ کر کے مسلمانوں کو بدظن کر دیا۔انکے حقوق کو پامال کیا۔ان کی زبان، روایات وتمدن کو کاری چرکے دیے اور یہ سب کچھ تم نے آنکھیں، کان، دل، دماغ اور عقل رکھتے ہوئے کیا تو پھر یہ کہنا کہ ہندو مسلم کشیدگی کا ذمہ دار انگریز ہے۔پرلے درجے کی غلط بیانی۔انتہا کی دیدہ دلیری اور نہایت مکروہ قسم کی خیرہ

چشمی ہے۔

حربہ پنجم: نمائندہ اسمبلی کا ڈھونگ

انگریز نے چھپن لاکھ انگریزوں کا خون بہا کر ہندوستان فتح کیا۔ یہاں سڑکیں بچھائیں۔ ریلیں بنائیں۔ ہزار ہا کالج، سکول بنائے۔ بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کیں۔ لالاؤں کو جہانبانی کے گر بتائے۔ انھیں تہذیب سکھلائی۔ علم کی روشنی سے منور کیا۔ فنون کی دولت سے مالا مال کیا اب اسے درخواستوں کے ذریعے ہندوستان سے نکالنا گاندھی جی کے دماغ میں آ سکتا ہے۔ نمائندہ اسمبلی بلا کر اپنی مرضی سے آئین وضع کرنے کے یہ معنی ہیں۔ کہ اے انگریزو۔ مقام دار وہا کے چند فدوی آپ سے گھٹنے ٹیک کر۔ ماتھے رگڑ کر۔ اور ہاتھ جوڑ کر درخوات کرتے ہیں۔ کہ تم اپنے ڈیڑھ سو سال کی کمائی ہمارے حوالے کر کے خود ایک ہفتہ کے اندر اندر ولایت چلے جاؤ۔ گاندھی جی کیا کسی قوم نے آج تک عرضیاں دے دے کر حکومت حاصل کی ہے۔

راجن بابو ہندوستان کے بے تاج بادشاہ فرماتے ہیں۔

"سول نافرمانی ہم نے شروع کر دی ہوتی لیکن خطرہ ہے کہ ہر شہر میں مسلمان ہم پر پل پڑیں گے اور بڑے فساد ہوں گے۔" (پٹنہ ۷۔ نومبر)

اگر آپ لوگوں کی ہمت کا یہ حال ہے کہ مسلمانوں کے خوف سے دھوتی ڈھیلی ہو رہی ہے۔ تو آزادی کے دشتِ پُر خار میں آپ قدم ہی کیوں دھرتے ہیں؟

علاوہ ازیں مسلمان اس فریب میں کیوں آئیں۔ نمائندہ اسمبلی میں ستر فیصدی آپ کے نمائندے ہوں گے۔ اور تیس فیصدی ہمارے۔ اگر گذشتہ اڑھائی

سال میں تمہاری اسمبلیوں میں ہماری فریادیں۔ نوائیں اور صدائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ اگر تم نے ہمارے جذبات کو نہایت بے رحمی سے کچلا اور ہمارے کسی احتجاج کی خس بھر پرواہ نہیں کی۔ تو ہم کیسے یقین کریں کہ نمائندہ اسمبلی میں ہماری آواز کو اہمیت حاصل ہوگی۔ ایک لمحہ کے لیے فرض کر لیا جائے کہ تم ہماری خواہش کے مطابق آئین بناتے ہو، پھر کیا ثبوت ہے کہ ہمارے ساتھ وہی کچھ ہو جو گذشتہ اڑھائی سال سے ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

رسولِ عربی ﷺ فداہ ابی وامی نے مسلم کی علامت یہ قرار دی ہے کہ۔

"ایک مومن ایک ہی سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔"

اس لیے آپ کچھ کہیں ہم آپ کے متعلق کبھی خوش ظن نہیں ہو سکتے۔

حربہ ششم:

۲۸۔ اکتوبر کو ایک مسلم نامہ نگار کے ایک مکتوب کا جواب دیتے ہوئے۔ گاندھی جی فرماتے ہیں:

"آزادی کے بعد مسلمانوں کا علیحدہ وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ مغلیہ سلطنت کے وقت یہاں صرف ایک قوم تھی۔ چین میں مسلمان علیحدہ حیثیت کے مالک نہیں۔ اسی طرح فرانس و انگلینڈ میں یہ امتیازی حیثیت نہیں رکھتے۔" کتنا بڑا فریب ہے۔ سلطنت مغلیہ کے وقت مسلمان فرمانروا تھے۔ انھیں تحفظ کے لیے آپ کی مدد درکار نہ تھی۔ چین و دیگر ممالک کی حکومتیں بڑی روادار اور فراخ دل ہیں۔ کسی قوم کو کچلنا ان کا نصب العین نہیں لیکن ہندوستان میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ اگر آپ

میں بھی وہ صفات ہوتیں جو جہانگیر واکبر جیسے عادل فرمانرواؤں میں تھیں تو ہمیں آپ سے الجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اور ایک علیحدہ قوم کا سوال پیدا نہ ہوتا۔

حربہ ہفتم:

چند روز ہوئے کانگرسی مسلمانوں نے ایک قرارداد پاس کی تھی۔

''کہ اگر آزادی کی راہ میں صرف یہی چیز حائل ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ تو ہم کانگریس سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ایسا کرے''

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کانگریس کو کس آئین کی رو سے یہ حق حاصل ہوا ہے۔ کہ وہ کسی جماعت کی نمائندگی کا فیصلہ کرتی پھرے؟ تمام عالم جانتا ہے کہ ہند میں اسی (۸۰) ملین مسلمان آباد ہیں جن کی کچھ روایات ہیں۔ کوئی تہذیب ہے۔ تمدن ہے۔ ایک زبان ہے۔ ان سب چیزوں کی حفاظت ضروری ہے۔ اگر کانگریس کو یہ مسلمان دکھائی نہیں دیتے تو آنکھوں کا علاج کرائے۔ اگر مسلم لیگ کی نمائندگی کا مسئلہ سمجھ نہیں آتا تو تو تزکیۂ دماغ کے لیے جُلاّب لے۔

واقعات سے آنکھیں بند کر لینا۔ اور حقائق کو جھٹلانا، اسی قوم کا کام ہو سکتا ہے کہ جس کی آنکھیں دیکھ نہ سکیں۔ دل سمجھ نہ سکے۔ اور جس کی عقل و دانش کا جنازہ نکل چکا ہو۔ کانگریس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ اور مسلم لیگ ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ اگر کانگریس اس حقیقت کا انکار کرتی ہے تو ہم منوانے پر ضد نہیں کریں گے حکومت برطانیہ تسلیم کر چکی ہے کہ مسلم لیگ

مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ (ملاحظہ ہو سر سموئیل مور اور لارڈ ٹیلنڈ کی تقاریر)۔

کانگریس جیسی بے دست و پا، بغض دغا گو و روحانی جماعت سے یہ حقیقت خواہ مخواہ تسلیم کرانا مسلم لیگ کی ہتک ہے۔ اگر خفاش وجود آفتاب کا انکار کر دے تو آفتاب کو کیا پڑی کہ وہ خفاش سے الجھتا پھرے وہ وقت بہت جلد آ رہا ہے۔ کہ کانگریس ببانگِ دہل اعلان کرے گی کہ واقعی مسلم لیگ مسلمانان ھند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن یہ اقرار ذرا بعد از وقت ہوگا۔

حربہ ہشتم:

کانگریس حکومت برطانیہ کو یہ الزام دیتی ہے کہ "وہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل پیرا رہتی ہے۔ کیا کانگریس نے چند زر خرید مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اسی اصول پر عمل نہیں کیا؟ اگر انگریز نے آج کانگریس سے کہا ہے کہ جاؤ پہلے اقلیتوں سے نپٹو۔ تو کیا کانگریس نے بارہا یہ اعلان نہیں کیا کہ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ بننا چاہتی ہے تو وہ پہلے کانگریسی مسلمانوں سے نپٹے؟ چند مسلمانوں کو ساتھ ملا لینا اور پھر ہمیں کہنا کہ جاؤ پہلے گھر کو سنوارو۔ بعینہٖ وہ برطانوی اصول ہے کہ جس کی زد میں آ کر آج کانگریسئے کائیں کائیں کر رہے ہیں۔

ہر چہ بہ خود نہ پسندی
برائے دیگراں مپسند

اس مقالہ کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں کانگریس کے کامیاب ترین اور مجاہد وزیر اعظم پنڈت پنتھ کا وہ سنہری وعظ درج کریں۔ جو آپ

نے ۲۸۔ اکتوبر کو ایوان اسمبلی کی بلندیوں سے اہل عالم کو ارشاد فرمایا۔ کہتے ہیں۔

"برطانیہ سے دوستی کی دوبارہ امید ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ برطانیہ تعصب اور نسلی امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر اپنے اقوال کو جامہ عمل پہنائے کہ ہم الفاظ بلا عمل کے قائل نہیں۔"

سبحان اللہ! کیا بلند تعلیم دی جا رہی ہے۔ اور معلّم کون ہے۔ وہی جس کے بے مثال عدل و انصاف سے سرزمین لکھنؤ اور بلند شہر خونِ مسلم سے لالہ زار بن گئی۔ اور جس نے پچیس ہزار مسلمانوں کو چھ ماہ میں جیل خانے بھیجا اور مسلم قوم کے غم میں پورے اڑھائی سال پگھل پگھل کر پھیپھڑے تک خراب کر بیٹھا۔

[مطبوعہ: روزنامہ احسان۔ لاہور بابت: ۱۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء]

☆☆☆
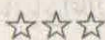
وائسرائے کا اعلان اور کانگرس

وائسرائے کا بیان نکلتے ہی کانگرس حلقوں میں اودھم مچ گیا۔ سرزمین ہند کے طول وعرض سے بھاگے بھاگے مہاتما جی کی خدمت میں پہنچے اور دہائی دینے لگے۔

''باپو جی'' اب پھرمایئے! انگریج تو ہم کو پوراسواراج نہ دیوت ہے۔

وہ کہت ہے۔ لڑائی کھتم ہوگا۔ تو دیکھے گا۔

گاندھی نے ان حواس باختہ لالوں پر ایک ملول نگاہ ڈالی۔ اپنی پیاری بکری کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔

اے ہندوستان کے مظلوم اور بے کس لالاؤ! گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی انگریز کا مزاج درست کیے دیتا ہوں۔

دنیا حیران تھی کہ پتہ نہیں مہاتما جی کون سا خطرناک حربہ استعمال کرنے لگے ہیں۔ آج ۲۳۔ اکتوبر کے اخبارات میں دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ گاندہی جی نے وزارتوں کو مستعفی ہونے کا حکم دیا ہے۔ پندرہ سال کے بعد بڑی قربانیوں، سختیوں، تکلیفوں اور بیشمار جدوجہد کے بعد یہ وزارتیں ملی تھیں وہ بھی غصّے میں آکر چھوڑ بیٹھے۔ جب کچھ دیر کے بعد غصہ فرو ہوا۔ اور دیکھا کہ اوہو کانگرسیوں کے جانے بعد مسلمانوں کو قربانی کی کھلم کھلا اجازت مل جائے گی۔ ودیا مندر کی سکیم دھری رہ جائے گی۔ اڑھائی سال کے رگیدے ہوئے مسلمان پھر پنپ اٹھیں گے۔ یو۔ پی میں خاکسار سب آزاد ہو جائیں گے۔ سنی شیعہ لڑنا چھوڑ دیں گے۔ کانگرس کا وہ آہنی پنجہ جو اسلامی تہذیب کی رگِ گلو تک پہنچ چکا تھا۔ پھر دور ہو جائے گا۔ اردو زبان؟؟ جس

کے کاشانے پر ہندی بھاشا کی خوفناک بجلیاں کوند کر اسے تباہی و ہلاکت کا پیام دے رہی تھیں بلا خوف وخطر اپنی منزل کی طرف چل کھڑی ہوں گی۔تو گاندھی جی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔کٹیا میں پہنچتے ہی کسی اخبار کے نمائندہ کو بلایا اور کہنے لگے۔کہ دیکھو بھیا۔ہماری یہ آواز ایوانِ حکومت تک پہنچا دو۔

کانگرس کی اس قرارداد کے باوجود صلح و مفاہمت کا راستہ کھلا ہے۔اگر وائسرائے چاہے تو اب بھی ہم من جانے کے لیے تیار ہیں اور یہ بگاڑ جواب پیدا ہونے لگا ہے۔رک سکتا ہے۔ (سول ملٹری ۲۳۔اکتوبر ۳۹ء)

اب یہ سوال تھا کہ وائسرائے کیسے چاہے۔تو آج ۲۴۔اکتوبر کے سول ملٹری میں گاندھی کے سب سے بڑے چیلے راج گوپال اچاریہ وزیرِ اعظم مدراس نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:

''دیکھئے وائسرائے صاحب اگر امن کے زمانے میں آپ کو صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کی ضرورت تھی۔تو لڑائی کی حالت میں تو اس کی ضرورت سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نے کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں کی تھی۔صرف اس قدر اعلان کرنے کو کہا تھا کہ آپ کی حکومت جنگ کے خاتمہ پر ہمیں ایسی حکومت عطا فرمائے گی کہ جس پر تمام اقلیتیں پوری طرح رضامند ہوں گی۔(سول ۲۴۔اکتوبر صفحہ ۵ تیسرا کالم پیراگراف ۱)

دیکھا آپ نے راج گوپال صاحب نہ تو پورا سوراج مانگتے ہیں۔اور نہ درجۂ نوآبادیات بلکہ صرف ایک اعلان اس مضمون کا مانگتے ہیں۔کہ خاتمۂ جنگ پر اقلیتوں کے پوری رضامندی واطمینان حاصل کرنے کے بعد ہمیں جو حکومت ملے گی

وہ منظور ہے اچاریہ صاحب کے کئی مقصد ہیں۔

اوّل یہ کہ کسی طرح وائسرائے صاحب ایک اور اعلان گول مول سا کردیں۔ اور اچاریہ صاحب لپک کر پھر وزارتوں سے چمٹ جائیں۔ حقیقتاً حکومت چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ یہ سرکاری کوٹھیاں، آگے پولیس کے پہرے۔ سرکاری موٹریں، مفت شوفر، مفت نوکر و خانسامے، دو چار اردلی پھر جہاں جائیں کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مصاحبت میں ہزاروں سلام کرنے والے ہر روز سینکڑوں نوکریوں خطابوں، جاگیروں کے لیے بنگلوں، کے اردگرد منڈلانے والے۔ حکومت کا نشہ فرمانروائی کا جلال، جہاں بانی کی ہیبت، جہاں پروری کا دماغ توبہ توبہ یہ کوئی بھولنے کی چیزیں ہیں، کہاں کسی صوبے کی عنانِ حکومت اور کہاں کسی پرائمری سکول کی ماسٹری، یا کسی جیل کی تاریک کوٹھڑی۔

اچاریہ صاحب کی یہ خواہش کہ وہ بدستور کرسی وزارت پر ڈٹیں رہیں۔ بالکل قدرتی اور فطری ہے اور ہمیں ان سے بے حد ہمدردی ہے۔

دوم چونکہ یہ لوگ وزارتوں کو چھوڑ چکے ہیں اب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہمدردی کسی نہ کسی طرح پھر حاصل کی جائے۔ اس لیے اچاریہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تو جناح صاحب! صرف ایسے نظام حکومت کے لیے کوشش کر رہے ہیں کہ جسے آپ پہلے منظور فرمائیں گے۔ بیان کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں۔

ترجمہ: جنگ کے خاتمہ پر ہمیں برطانیہ صرف ایسا نظام دینے کا عہد کرے کہ جسے تمام اقلیتیں پسند کریں۔ اور اپنی منظوری کی اس پر مہر ثبت کریں۔

خدا جانے اچاریہ صاحب آپ اقلیتوں پر کیوں اس قدر مہربان ہو رہے

ہیں۔ کہ محبت چھلک چھلک کر باہر گر رہی ہے۔ اجی صاحب! آپ مسلمانوں کو اس قدر احمق کیوں سمجھتے ہیں گویا وہ آپ کی ان ہشیاریوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جس قوم نے آپ پر چھ سو سال حکومت کی اور دنیا کے مختلف ملکوں پر اب بھی حکمران ہے کیا دماغی طور پر آپ اسے اتنا دیوالیہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ جیسے لالے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتی۔ اگر آپ اقلیتوں کی منظوری و دلبر نذیدگی کے اس قدر دلدادہ ہیں۔ تو یہ جذبہ اس وقت کہاں تھا، جب ۱۹۳۸ء میں حکومتِ بہار نے سولہ مقامات پر گائے کی قربانی روک دی تھی۔ جب حکومت بمبئی نے سترہ مسلمان اخباروں سے بہت بھاری ضمانتیں طلب کی تھیں جب حکومت یو۔ پی نے ۲۰ شیعہ سُنی سپردِ زنداں کر دیے تھے۔ اور خاکسار قیدیوں پر گولی چلا کر ان کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپایا تھا۔ کیا یہ سب کچھ اقلیتوں کی منظوری سے ہو رہا تھا۔ کیا ودیا مندر سکیم مسلمانوں نے کعبہ میں تیار کی تھی اور آپ نے اسے نافذ فرما کر ان پر احسان عظیم کیا۔ کیا اُردو کو مٹانے کی اجازت مسلمانوں سے آپ نے حاصل کی تھی۔ کیا ہندی کو ہندوستان کی متفقہ زبان بنانے کی درخواست مسٹر جناح کی طرف سے آپ کے دفتر میں موصول ہوئی تھی۔ کیا سکولوں میں بندے ماترم کا قابلِ صد نفرت گیت رائج کرنے کے لیے مسلم لیگ آپ کے ہاں چل کر آئی تھی۔ اگر تم لوگوں نے بس اڑھائی سال کے عرصے میں ہماری چیخ پکار اور آہ و واویلا کے باوجود یہ سب کُچھ کیا تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ مکمل آزادی ملنے کے بعد تُم اس سے بڑھ کر مسلم کش ثابت نہیں ہو گے۔

مسلم لیگ اور اعلانِ وائسرائے:

مسلم لیگ کا یہ اقدام نہایت مستحسن ہے کہ اس نے وائسرائے کے اعلان پر

تشفی کا اظہار کیا ہے اور ہمیں محکم امید ہے کہ مسٹر جناح بہت جلد تمام مسلمانانِ ہند کی خدمات جنگ کے لیے پیش فرمائیں گے۔ مسلمانوں کی تلوار زنگ آلود ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ اسے دشمن کے خون سے پھر سیراب کیا جائے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے جوہرِ آبائی کو زندہ رکھے اور میدانِ جنگ میں جا کر ان تمام غلاظتوں کو جھاڑ آئے جو زمانہ امن میں کاہلی، بے کاری اور بے عملی کی وجہ سے ہر قوم میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

[مطبوعہ: روزنامہ احسان۔ لاہور بابت: اکتوبر ۱۹۳۹ء]

☆☆☆
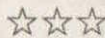
اسلام اور نیشنلزم

کچھ عرصہ ہوا، مسٹر جناح نے فرمایا تھا، کہ میں مسلمان پیدا ہوا ہوں۔ مسلمان رہوں گا، اور مسلمان مروں گا۔ اس پر تمام ہندو چلا اٹھے اور مسٹر جناح کو فرقہ پرستی اور تنگ نظری وغیرہ کے طعنے دینے لگے۔

ہندوؤں کا خوفناک حربہ:

ہندوؤں نے اپنی سیاسی لغت میں دو نئے لفظوں کا اضافہ کیا ہے۔ (۱) نیشنلزم (قومیت پرستی) (۲) کمیونزم (فرقہ پرستی) ہر وہ اقدام جو ہندوستان میں رام راج قائم کرنے میں مدد دے نیشنلزم ہے۔ اور ہر وہ آواز جو کوئی جماعت اپنے حقوق کے تحفظ میں بلند کرے، کمیونزم ہے۔ کمیونزم کو تباہ کرنے کے لیے ہندو پریس نے وہ بے پناہ پروپیگنڈا کیا کہ بڑے بڑے مسلمان اس رو میں بہ نکلے۔ اور وہ قطعاً نہ سوچ سکے۔ کہ اس نیشنل ازم کی حسین ادا میں فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کی ایک قبیح الشکل چڑیل چھپی ہوئی ہے۔ اور کمیونزم کے خلاف یہ ہنگامہ دراصل مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو مرعوب کر کے خاموش کرنا ہے۔

پہلے ہندوستانی پھر مسلم یا ہندو

مسٹر گاندھی یہ سبق نہایت شدومد سے دے رہا ہے کہ ہندوستان کا اصلی خیر خواہ وہ ہے جو پہلے ہندوستانی ہو اور پھر کسی مذہب کا پیرو۔ یہ فلسفہ ایک زبردست مکاری ہے۔ تاکہ مسلمان کے دماغ سے اسلام کا صحیح تخیل نکال دیا جائے۔ اسلام میں مذہب، سیاست ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں تفریق پیدا کرنا اسلام کو قلب بے روح بنانا

ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ جس کا منشا اس زمین کو سنوارنا ہے۔ اللہ کی اس حسین بستی میں توازن قائم کرنا ہے۔ عدل وانصاف اور مساوات قائم کرنا ہے۔ اور جہالت کا استیصال کرنا ہے۔ دنیا کو اخوت کے رشتے میں پرونا ہے۔ محبت کی نہرِ سلسبیل بہانا ہے۔ موذی کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ اود دنیا میں امن وسکون قائم رکھنے کے لیے طاقت حاصل کرنا ہے۔ قوت وہیبت، رعب وجلال حاصل کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، جس مذہب کا پہلا درس جہانگیری و جہانبانی ہو، کفر وعصیاں کے خلاف مسلسل جہاد ہو۔ حصولِ قوت ہو، کیا آپ ایسے مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ جہاں تک مجھے علم ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ ''مذہب'' کہیں استعمال نہیں ہوا اس کی بجائے دین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ قانون جو اللہ نے انسانوں کو انسانیت کی بہبود کے لیے عطا فرمایا۔ وہ آئین قرآن حکیم ہے۔ جس میں ارشا ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم اس آئین پر چلو گے۔ تم وارثِ دین قرار دیے جاؤ گے اور تم جب کہیں اس آئین، اس طریق اور اس صراط مستقیم سے بھٹک جاؤ گے۔ تو پہلی سزا تمہیں یہ ملے گی کہ تمہیں غلام بنا دیا جائے گا۔

تو جس قوم کا یہ مذہب، یہ طریق اور قرآن ہو، اسے قرآن سے الگ رہنے کی تلقین کرنا۔ اسے لامذہب، کافر اور منکرِ قرآن بنانا ہے۔ ہندوؤں کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ ہمارا مذہب محض پرائیویٹ عقیدے محض تپسیا، پوجا کا نام نہیں بلکہ ہمارے ہاں نشست و برخاست، خواب وخور، نماز وعبادت، محبت ومودّت، امارت وسیادت، امامت وسلطنت، سب کے لیے مفصل دستور العمل موجود ہے۔ جس پر چلنا مذہب ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ ہم نیکی کا حکم دیں بدی سے روکیں علم پڑھیں اور پڑھائیں۔

تجارت کریں حسب مقدور دنیا بھر کا سفر کریں۔ نمازیں پڑھیں۔ روزے رکھیں، قدرت کی ہر چیز میں تدبر و تفکر کریں۔ اڑتے ہوئے پرندوں، حیوانوں، درختوں، پہاڑوں اور ستاروں کا آنکھ سے یا خوردبین و دوربین سے مطالعہ کریں۔ ہمیں حکم ہے کہ ہم جمعیت پیدا کریں اور اس قدر طاقت حاصل کریں کہ ہمارے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر دشمن غش کھا جائے۔ وَاَعِدُّوْ لَهُم مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيلِ تُرهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

ترجمہ: اے فدائیانِ اسلام (تم وہ قوت پیدا کرو کہ تمہارے اصطبلوں میں گھوڑے اس ٹھاٹھ سے بندھے ہوئے ہوں کہ اللہ کے دشمن لرز جائیں۔ اور تمہارے دشمنوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (قرآن حکیم)

ترجمہ: تم اگر مومن رہے، تم ہمیشہ غالب رہو گے۔

تو جس قوم کا یہ مذہب ہو یہ دستور العمل ہو اسے یہ کہنا کہ سیاست مذہب سے علیحدہ کردو۔ اس کے قرآن کی صریح ہتک کرنا ہے۔ اس کے ایمان پر خوفناک ڈاکہ ڈالنا ہے۔ اور اس کی مقدس تعلیم پر رہزنی ہے۔ مسلمان صرف مسلمان رہ کر اور قرآن پر چل کر ہی آزاد ہو سکتا ہے۔ وہ آزادی کی کسی اور راہ سے ناواقف ہے۔ اس کے کان صرف پیام الٰہی کی طرف لگے ہوئے ہیں۔ اس کے دل میں صرف اللہ اور اس کا مقدس کلام بستا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف الفاظ میں کہہ رکھا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ وَعَمِلُوْ الصّٰلِحٰتِ مِنْكُمْ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (قرآن حکیم)

ترجمہ: اللہ مسلمانوں سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ احکام الٰہی کے پابند رہے، تو انھیں زمیں پر فرمانروا بنادیا جائے گا۔

یہ وعدہ کسی سیاسی لیڈر کا نہیں کہ ایفانہ ہو۔ بلکہ یہ صادق المیثاق خدا کا وعدہ ہے۔ یہ رب الملائکہ کا وعدہ ہے جو ہر زمانہ میں پورا ہوتا رہا۔ اور آئندہ بھی جہاں کہیں صلاحیت سلطنت ہوگی ضرور پورا ہوگا۔ گویا کہ مسلمان کو اللہ پہلے جہانبانی کا سبق دیتا ہے۔ پھر دعذہ کرتا ہے اور پورا کرتا ہے اور جس کی علامت زندگی اللہ نے جذبۂ جہانگیری قرار دے رکھا ہے۔ ایسی قوم کو یہ کہنا کہ وہ سیاست سے الگ ہو جائے۔ اسے الحاد و بے ایمانی کی تعلیم دینا ہے مسلمان آگاہ ہو جائیں کہ صیّادانِ دار و ہا کا یہ ہم رنگِ زمین دام بڑا بھاری فریب ہے۔ اسلام کی روشن تعلیم پر دن دہاڑے ڈاکہ ہے۔ اور مسلمان کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنے کا خوفناک ارادہ ہے۔ مسٹر جناح نے بالکل درست کہا ہے اسلامی تعلیم کے مطابق کہا ہے رسول عربی ﷺ کی پیروی میں کہا ہے اور تمام مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ وہ ہر جگہ پکار پکار کر بانگِ دہل کہیں کہ ''ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں، مسلمان رہیں گے اور مسلمان مریں گے۔ ہم مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں ہیں۔''

جو مسلمان ہندو پروپیگنڈا سے گھبر کر بعض اوقات یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ ہندوستانی پہلے ہیں اور مسلم بعد میں، وہ پیامِ الٰہی کا استخفاف کرتے ہوئے اور مذہب اسلام سے اپنی زبردست جہالت کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر ہندو ودیا مندر سکیم جاری کرتے، گائے کی قربانی روکتے۔ مسلمان پریس کا گلا گھونٹتے، اردو پر کلہاڑا چلاتے اور خاکساروں کو قتل کرتے وقت مسلمان سے نہیں ڈرتا۔ تو مسلمان یہ کہتے ہوئے کہ

''وہ مسلمان پہلے ہے اور باقی سب کچھ بعد'' ہندو سے کیوں ڈرے، مسلمان کو ہمیشہ دلیری سے کام لینا چاہیے کہ اس کا مذہب اسے دلیری، سچائی، صداقت، شجاعت اور راست روی کی تعلیم دیتا ہے۔

ہندوؤں کی تہذیب:

جب تک ہندو سوسائٹی پر گیتا کی مقدس تعلیم کا اثر رہا اس میں زندگی کے آثار باقی رہے لیکن جب مفت خورے برہمنوں، خود غرض پنڈتوں اور تنگ نظر و جاہل مذہبی رہنماؤں نے اس جماعت کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا تو اس قوم کی مذہبی تعلیم کو مسخ کر دیا گیا۔ مذہب صرف ماتھے پر سیندور کا ٹکہ لگانے مختلف مورتیوں کے آگے جھکنے۔ ہون۔ برت۔ تپسیا اور چند رسوم کا نام بن کر رہ گیا۔ صوفیا بدھ مت کے زیر اثر برہمنوں نے ہندوؤں کو ترک دنیا کی تعلیم دینی شروع کر دی نتیجہ یہ نکلا کہ سادھوؤں کے جھنڈ کے جھنڈ دنیا کو لات مار کر مندروں، تالابوں، دریاؤں، پاٹ شالوں اور مذہبی استھانوں میں جا براجمان ہوئے۔ ان لوگوں نے تنور شکم تاپنے اور جذبات حیوانی کو تسکین دینے کے لیے مذہب میں وہ وہ رنگین جدتیں پیدا کیں۔ اور ایسے اصول وضع کیے کہ الامان والحذر۔ (ملاحظہ ہو، کفر توڑ مصنف غازی محمود دھرم پال)

ان برہمنوں، سادھوؤں و کوتاہ نظر پنڈتوں کی وجہ، سے ہندو دھرم اپنی اصلیت سے کوسوں دور جا پڑا۔ ہر چند کہ انگریزی تہذیب کے طوفان نے ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ قطعاً بدل دیا ہے۔ اور نوجوانوں میں مذہب سے بیزاری کے روز افزوں آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہندو دھرم پر جو ہزار ہا غلاف ان مذہبی اجارہ داروں نے چڑھا

دیے تھے، وہ بدستور باقی ہیں۔ اور اس وقت بھی ہندو دھرم چند پرائیویٹ عقیدوں کا نام خیال کیا جاتا ہے۔ جس کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے بیرونی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس تہذیب اور اسلامی تہذیب میں ہزار ہا فرسنگ کی تفاوت ہے۔ ہمارے ہاں سلطنت و تعمیر دنیا جز و مذہب ہیں اور وہاں ترکِ دنیا و تخریب دنیا مذہب کا پہلا اصول ہے۔ اس لیے ہندو مجبور ہے۔ کہ وہ ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرتے وقت اپنی موجودہ تہذیب کو چھوڑ کر قومیت متحدہ کی تشکیل میں اس کی مدد کرے۔

سوامی کپورنا نند وزیر تعلیم یو۔ پی فرماتے ہیں:

''ہندوستانی تہذیب تبھی زندہ رہ سکتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں

(اخبار ''مدینہ'' نومبر۔ ۱۹۳۸ء)

کوئی ان سے جا کے پوچھے کہ ہندوستان میں تو صرف دو قوموں یعنی ہندو مسلم کی تہذیبیں ملتی ہیں۔ اگر یہ تہذیبیں مٹا دی جائیں۔ تو ہندوستان بے تہذیب رہ جائے گا۔ ہندوستان کی تہذیب کیسے ترقی کرے گی؟ غالباً لالہ جی کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مسلمان اپنی تہذیب کو چھوڑ دیں، بعد میں ہم ان سے کہیں گے۔

''اجی مہاراج، اب آپ ہم سے ہماری تہذیب کیا چھوڑاتے ہیں، آپ نے جو چھوڑ دی ہے۔ تو بس اب صرف ایک ہی تہذیب باقی رہ گئی ہے۔ چلو! اس کو اختیار کر لیں۔ کون نئی تہذیب بناتا پھرے۔''

ایک 'قوم پرست' مسلمان صاحب، مسلمانوں کو یوں مشورہ دیتے ہیں:

''مسلمانوں کے باہمی اختلافات دور کرنے کی صرف یہی تدبیر ہے، کہ وہ

کسی ایسے ادارے میں شامل ہو جائیں۔ جو مذہب سے بالکل علیحدہ اور صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو، اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے۔

(''مدینہ'' ۱۳۔ اگست ۱۹۳۸ء)

اس مسلمان کی جہالت کا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں۔

ع چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

پنڈت نہرو کہتے ہیں۔

''جس چیز کو مذہب کہتے ہیں۔ اسے ہندوستان و دیگر مقامات میں دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے مٹا دینے تک کی آرزو ہے۔'' (''میری کہانی'' صفحہ ۱۶۱)

ہندوستان میں بڑے بڑے مذہب دو ہی ہیں۔ نہرو صاحب کس مذہب کو مٹانا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا مشکل نہیں۔ ڈاکٹر سید محمود وزیرِ تعلیم صوبہ بہار مسلمانوں کو یوں مشورہ دیتے ہیں:

''لفظ ہندی زبان کے لیے نہیں بلکہ اسے اہلِ ہند کو اختیار کرنا چاہیے۔

(''جامعہ'' اکتوبر ۳۶ء)

اردو ہندی و پنجابی میں ''واؤ'' اور ''یا'' نسبت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہند اسم ہے جس کے آگے ی یا واؤ بڑھا دیں تو اس کے معنی ہوں گے۔

''ہند سے نسبت رکھنے والا''۔ اگر ہم محمود صاحب کے مشورہ پر عمل کریں۔ اور اپنے آپ کو ہندی کہنا شروع کر دیں، تو کچھ عرصہ کے بعد آپ فرمائیں گے۔

''ارے بھائی ہندی و ہندو بدستور دو علیحدہ علیحدہ لفظ ہیں۔ جو قومیت متحدہ کی تشکیل

میں حائل ہیں۔ اور ہندی و ہندو میں فرق ہی کیا ہے۔ صرف یا و واؤ کا۔ ہر دو لفظ نسبتی ہیں۔ کوئی سالگا دو، معنی وہی رہتے ہیں، آپ ہندی تو پہلے ہیں ہی اگر ہندو کہلانے لگ جاؤ، تو بس پھر بیڑا پار ہے۔"

ایک اور مقام پر نہرو صاحب فرماتے ہیں۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینا بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

ان حوالہ جات سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ نیشنلزم کے معنی اسلامی تہذیب کا استیصال کر کے بھارت ورش سے باہر پھینکنا ہے۔ اور اس امتیاز کو یوں مٹانا ہے۔ کہ ہندوستان میں اپنے آپ کو مسلم کہلانے والا کوئی باقی نہ رہے، ہر طرف کچھ ہندو ہوں اور کچھ ہندی اور مؤخر الذکر کی یائے کچھ روز بعد واؤ سے بدل دی جائے۔

قومیت متحدہ پیدا کرنے کی تجویز:

اگر ہندو حضرات واقعی ایک ایسی قومیت ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں ،جس میں ہندو مسلم کا امتیاز باقی نہ رہے، تو میں ایک تجویز عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ اگر مسلمان آریہ دھرم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے، تو آپ ہی ذرا اسلام کے آغوش میں آجائیں تا کہ آپ کی دنیا و آخرت سنور جائیں۔ پھر آپ چین سے تمام ہندوستان پر حکومت کریں۔

مسئلہ وطن:

اسلام میں وطن کا تخیل تو بہت زیادہ وضاحت چاہتا ہے، یہاں صرف اتنا

عرض کر دینا چاہتا ہوں، کہ اسلام کے نزدیک تمام زمین مسلم کا وطن ہے۔ نہ صرف وطن ہے بلکہ کعبہ کی طرح مقدس ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

جعلت فی الارض مسجداً (بخاری)

ترجمہ: اللہ نے تمام زمین میرے لیے مسجد بنا دی۔

تو جو مقام رسول کے لیے مسجد ہے، وہ ہمارے لیے حرم جتنا مقدس ہے۔ بس اسلام میں زمین کا تخیل یہ ہے کہ وہ کعبہ کی طرح مقدس ہے، جس طرح کعبہ میں فتنہ وظلم، جنگ وقتال ناجائز ہے، اسی طرح زمین پر بھی یہ چیزیں ناجائز ہیں۔ جس طرح کہ ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ کعبہ میں یہ جرائم نہ ہونے دے، اسی طرح مسلمانانِ عالم کا فرض ہے کہ وہ اس قدر طاقت پیدا کریں۔ کہ زمین کے مقدس چہرے پر ظلم کی وجہ سے خون کا کوئی قطرہ نہ گرے یہاں کوئی جوانہ کھیلے، الغرض کسی طرح کی شرارت، گناہ، فتنہ، ظلم، بے انصافی وغیرہ نہ ہو۔

یا مرون با لمعروف و ینھون عن المنکر.

ترجمہ: مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیں اور ہر برائی سے روکیں۔

حکم وہی ہے کہ جس کے پاس حکومت ہو۔

طالب العلم تاریخ کو یاد ہوگا کہ حضرت طارق نے جبرالٹر پر کشتیاں جلا کر کہا تھا۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

حضرت اقبال فرماتے ہیں:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

قرآن حکیم میں ایک مقام پر وارد ہوا:

الارض لله. یورثها من یشاءُ من عبادہٖ والعاقبة للمتقین

ترجمہ: زمین کا مالک اللہ ہے، اور متقی لوگ ہی بالآخر اس کے وارث بنتے ہیں۔

مسلمانوں کو متقی ہونے کا دعویٰ ہے۔ اس لیے وہ زمین کے بھی وارث ہیں، ہندوستان زمین کا ایک مختصر سا ٹکڑہ ہے، اور ہماری عالمگیر محبت میں وہ بقدر جثہ حصہ دار ہے۔ ہمارا مذہب عالمگیر ہے۔ ہم خود عالمگیر ہیں اور ہماری محبت عالمگیر، مسلمان دنیا کے ہر حصّہ میں آباد ہیں۔ مذہباً تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہر آدمی کو اپنے بھائی کے گھر سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اور اسے بھی تقریباً اپنا ہی گھر خیال کرتا ہے۔ اس لیے اگر ایک مسلمان تمام عالم کو اپنا وطن سمجھے، تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے تو وہ فطرتاً و مذہباً مجبور و مامور ہے، ہندوؤں کو اس پر برا نہیں ماننا چاہیے۔ یہ ہمہ گیری مسلم و اسلام ہر دو کی فطرت میں ہے، وطن سے محبت کرنا آپ نے انگریزوں سے سیکھا اور ہمیں ۱۳۵۸ سال پہلے بتلایا گیا تھا۔

حب الوطن من الایمان

(وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے) فرق صرف اتنا ہے، کہ آپ کا نقطۂ نگاہ وطن کے متعلق بالکل محدود ہے۔ آپ ہندوستان کو وطن کہتے ہیں۔ اور ہم تمام روئے زمین کو، کہ جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ اپنا گھر سمجھتے ہیں۔

ذرا نگاہ پھیلا کر دیکھئے۔ کہ تمام دنیا کے سمندر ہماری خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ کشمیر ہمارے لیے زعفران اگاتا ہے۔ عراق میں ہمارے لیے پٹرول و تیل تیار ہوتا ہے۔ بغداد و بصرہ بہترین کھجوریں اُگاتے ہیں۔ کوئٹہ کے انگور و سردے، ہر حصّہ زمین میں پہنچتے ہیں۔ اگر زمین کا ہر حصّہ ہماری کوئی نہ کوئی خدمت سرانجام

دے رہا ہے۔ تو ظلم ہوگا، احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ہر حصہ زمین سے برابر محبت نہ کریں۔

ما حاصل یہ کہ تمام زمین مسلم کا وطن ہے۔ اور کہ مسلم کا مذہب ہی اس کی سیاست ہے۔

[مطبوعہ روزنامہ احسان ____ لاہور]

☆☆☆

حضور ہر ہٹلر صاحب بہادر کے بالکل سچے وعدے

سچ کی قسمیں:

سچ کی کئی قسمیں ہیں ایک تو وہ سچ تھا جو آج سے کئی ہزار سال پہلے ہمارے بزرگ بولا کرتے تھے ایک سچ وہ ہے جو آج ہندوستان جنت نشان میں بولا جاتا ہے اور جس کے ہم خدا کے فضل سے بہت ماہر ہو چکے ہیں۔ ایک سچ وہ ہے جو قسم کھا کر عدالتوں میں بولا جاتا ہے اور ایک سچ وہ ہے جو ہمارے وکیل بغیر قسم کھائے فی البدیہہ بولا کرتے ہیں۔ ان تمام سچائیوں کی سرتاج وہ سچائی ہے جو برلن سے نکلا کرتی ہے۔

ہر ہٹلر نے ۲۰۔ فروری ۱۹۳۳ء کو برلن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''میری حکومت کا پہلا پروگرام یہ ہے کہ ہم نہ تو جھوٹ بولیں گے اور نہ کسی کو دھوکا دیں گے۔''

پھر پوسٹڈم میں ۲۱۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو کہا:

''ہم اپنی سچائی سے اُن زخموں پہ مرہم رکھیں گے جو گذشتہ جنگ میں صلح پسند اقوام کو سہنے پڑے۔''

سچائی کے دیوتا آڈلف ہٹلر نے ۱۷۔ مئی ۱۹۳۳ء کو برلن سے تقریر کرتے ہوئے اپنے ارادوں کا یوں نقشہ کھینچا:

''جرمنی، فرانس اور پولینڈ دُنیا میں زندہ رہیں گے۔ آیندہ کوئی جنگ دُنیا کے حالات کو بہتر بنانے میں کامیاب نہیں ہوگی بلکہ یورپ کا موجودہ نظام بھی تباہ ہو جائے گا۔ ہمارا مقصد صرف ایک ہی ہے اور وہ دُنیا میں امن قائم رکھنا

ہے۔ ہم نوآبادیات و دیگر مسائل کا تصفیہ صرف باہمی گفت وشنید سے کریں گے اور ہم کسی ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

۲۷۔ مئی ۱۹۳۸ء کو ہٹلر نے کہا:

"ہم کسی ملک کو فتح کر کے جبراً اپنے علاقے میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔"

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو برلن ریڈیو سٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا:

"ہم کسی قوم کو مٹانا نہیں چاہتے اور حقیقتاً بڑا ظلم ہوگا اگر ہم اپنے کئی لاکھ نوجوانوں کی قربانی دے کر کسی ایسی قوم کو اپنا محکوم بنائیں کہ جو جرمن نہیں ہیں۔"

ہٹلر نے ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء اور ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۳ء کو پھر کہا کہ ہم کسی سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ۱۳۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو برلن میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا:

"ہم پولینڈ کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ آسٹریا پر ہم حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ مسئلۂ سار کے تصفیہ کے بعد ہم لوکارنو کے عہد نامہ کی ہر طرح تعمیل کریں گے۔ ہم کسی قوم سے لڑنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ہم دُنیا کے امن اور سلامتی میں اضافہ کرنے کی آخری کوشش کریں گے۔"

۱۷۔ جون ۱۹۳۵ء کو گیرا (Gera) کے مقام پر ہٹلر نے کہا:

"ہم اپنے گھر میں امن، فارغ البالی اور خوش حالی چاہتے ہیں اور گھر سے باہر دوسری اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات۔"

برلن سے ۲۱۔ مئی ۱۹۳۵ء کو ارشاد ہوا:

"ہم بغیر کسی مزید شرط کے معاہدۂ لوکارنو کے پابند رہیں گے اور ہم اعلان

کرتے ہیں کہ پولینڈ ایک آزاد قوم کا وطن ہے کہ جس کی آزادی کو ہم برقرار رکھیں گے۔ ہم صرف بولشوزم کے دشمن ہیں اور آسٹریا پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

معاہدۂ لورکانو کی دھجیاں ہوا میں:

اس سلسلے میں پہلی تقریر کولون (Cologne) کے مقام پر ہٹلر نے ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو کی تھی جس کے دوران میں کہا تھا:

"ہم یورپ میں ہر قوم کے لیے مساوی حقوق چاہتے ہیں۔"

پھر برلن سے ۱۱۔ جنوری ۱۹۳۷ء کو کہا: "ہر قوم کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ سیاسی و اقتصادی معاملات میں پوری طرح آزاد ہو۔"

اس کے بعد نیورمبرگ سے ۱۰۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو کہا:

"روس میں یہودی بالشویک دُنیا کے امن و امان کو تہ و بالا کرنا چاہتے ہیں، ہم اس خطرے سے پوری طرح آگاہ ہیں۔"

یکم مارچ ۱۹۳۸ء کو برلن سے کہا:

"ہم اپنی خارجہ پالیسی کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ ساڑھے تین کروڑ جرمن کے لیے دریا تک پہنچنے کا کوئی راستہ موجود نہیں۔ تاریخ اس بات پر گواہ رہے گی کہ ہم نے دُنیا کے امن میں خلل ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب معاہدۂ لورکانو سے پہلے فرانس نے چیکوسلوویکیا اور پولینڈ سے باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تو ہم نے بُرا نہ منایا۔ پولینڈ اور فرانس دُنیا میں باقی

رہیں گے۔لیکن روس کی اُلٹی فلاسفی یورپ کے امن و امان کو دھمکا رہی ہے۔ہم آج تمام دُنیا کے سامنے اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دوسری اقوام کا ہر طرح ہم پلہ سمجھتے ہیں۔''

آسٹریا کی شامت:

۲۴۔فروری ۱۹۳۸ء کو میونخ میں ہٹلر نے کہا:

''ہم تمام اقوام کے ساتھ صلح و محبت سے رہنا چاہتے ہیں۔آسٹریا کے ساتھ ہماری کوئی پُرخاش نہیں اور ہم اس کی آزادی کو برقرار رکھیں گے۔''

لیکن صرف پندرہ یوم کے بعد یعنی ۱۱۔مارچ ۱۹۳۸ء کو ہٹلر کی فوجیں آسٹریا پر قابض ہو گئیں اور یکم مئی ۱۹۳۸ء کو برلن سے ہٹلر نے اعلان کیا:

''ہمارا ماٹو ہے Never war again یعنی آیندہ کوئی جنگ نہیں ہوگی۔''

برلن سے ۲۶۔ستمبر ۱۹۳۸ء کو یوں گوہر افشانی کی:

''ہم دوسری اقوام کو محکوم نہیں بنانا چاہتے۔ہم پولینڈ کی آزادی کو برقرار رکھیں گے۔ہاں ہمیں صرف دریا تک جانے کے لیے ایک راستے کی ضرورت ہے۔ہم تمام اقوامِ عالم کو اپنے پُر امن ارادوں کا یقین دلاتے ہیں اور یہ صرف لفظی اعلان نہیں بلکہ ہمارا محکم ارادہ ہے کہ دُنیا میں امن قائم رکھیں۔ہاں سوڈنٹ لینڈ کا علاقہ ہمارا ہے اس کے بغیر ہم یورپ میں کسی اور علاقے پر آنکھ نہیں رکھتے۔مسٹر چیمبرلین (وزیرِ اعظم برطانیہ) کو میں یقین دلاتا ہوں کہ سوڈنٹ لینڈ کے بغیر ہم قطعاً کسی علاقے پر دست درازی نہیں کریں گے۔چیکوسلوویکیا کی آزادی کے ہم ذمہ دار ہیں۔''

چیکوسلوویکیا و میمل:

۲۶۔ستمبر ۱۹۳۸ء کو ہٹلر نے چیکوسلوویکیا کی آزادی کا اعلان کیا لیکن صرف اڑھائی ماہ کے بعد یعنی ۱۵۔مارچ ۱۹۳۹ء کو چیکوسلوویکیا اور ۲۱۔مارچ ۱۹۳۹ء کو میمل پر قبضہ کرلیا۔

پھر ۲۸۔اپریل ۱۹۳۹ء کو وِلہم شیون سے اعلان کیا:

''ہم کسی قوم پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ہم نے یورپ کو امن وسلامتی کا تحفہ دیا ہے کہ جسے ہم قائم رکھیں گے۔۱۹۱۸ء سے لے کر اب تک روس دس لڑائیوں میں شامل ہو چکا ہے لیکن ہم جنگ سے دور رہے۔یہ ہماری شرافت کا ثبوت ہے۔مسٹر روزوولٹ کہتا ہے کہ کئی قوموں کو جرمن حملے کا خطرہ ہے۔میں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ہم کسی قوم پر ہرگز حملے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ہم روزوولٹ سے زیادہ امن وسلامتی کے خواہاں ہیں۔''

پولینڈ:

۲۱۔اگست ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے روس سے ایک معاہدہ کیا اور یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر چڑھائی کر کے ۱۹۔ستمبر تک اُسے ختم کردیا۔

پولینڈ کے ساتھ جنگ چھڑتے ہی ہٹلر نے اعلان کیا:

''میں نے اپنے ہوابازوں کو سخت ہدایت کی ہے کہ وہ کھلے شہروں پر قطعاً بمباری نہ کریں اور کہ کوئی بچہ اور عورت جنگ میں ہلاک نہ ہو۔''

لیکن جنگ کے پہلے ہی دن پولینڈ کے شہروں پر بلا امتیاز بمباری شروع کر دی گئی اور ۳۔ستمبر ۱۹۳۹ء کو ''اتھینیا'' جہاز جس پر امریکہ جانے والے چودہ سو مسافر سوار تھے ڈبو دیا گیا اور جو کچھ جزیرہ برطانیہ کے ساتھ ہوا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ڈینزگ کے مقام پر تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے کہا:

''میں فرانس اور برطانیہ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی سرحدوں سے ایک انچ بھی آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔''

لیکن ۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کر دیا اور ۱۰۔ مئی ۱۹۴۰ء کو ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر ہلّہ بول دیا۔ ۵۔ جون ۱۹۴۰ء کو فرانس میں داخل ہو گیا ۔۱۲۔ جون ۱۹۴۰ء کو پیرس فتح کر لیا۔ ۱۸۔ جون ۱۹۴۰ء کو فرانس نے عارضی صلح کی درخواست پیش کر دی۔ جو ۲۲۔ جون کو کمپائی کے جنگل میں منظور کی گئی اور ۲۶۔ جون کو فرانس اور جرمنی میں جنگ ختم ہو گئی۔

ہندوستان:

یورپ کی دوسری اقوام کی طرح جرمنی نے بارہا ہندوستان کی آزادی کا بھی اعلان کیا ہے، خدا خیر کرے۔ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو شام کے آٹھ بجے برلن ریڈیو سے کہا گیا: ''ہم ہندوستان کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اسے کسی صورت میں بھی اپنا غلام نہیں بنانا چاہتے۔''

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
''ہم'' بھی ''ہیں'' ایک عنایت کی نظر ہونے تک

[مطبوعہ درسہ ماہی رسالہ مشعل (جنگ نمبر)، اٹک بابت مارچ ۱۹۴۱ء]

☆☆☆

شاندار جُھوٹ

اس ڈرامے کا درمیانی حصّہ ''آواز'' سے ماخوذ ہے۔ ابتدائی حصّہ ایڈیٹر (برق) کی تصنیف ہے اور خبروں والا حصہ پروفیسر عبدالرشید ایم۔ ایس۔ سی معلم طبیعات۔ پروفیسر عزیز احمد بھٹی معلمِ انگریزی۔ پروفیسر فضل احمد قریشی معلم تاریخ اور راقم کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے، ۲۹ جنوری ۱۹۴۱ء کو یہ ڈرامہ کالج ہال میں دکھلایا گیا۔ اور بہت پسند کیا گیا اداکاروں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱) ڈاکٹر گوئبلز (پروفیسر فضل احمد قریشی)

۲) جرمنی زبان کا انونسر (ڈاکٹر برق)

۳) انگریزی زبان کا انونسر (پروفیسر عزیز احمد بھٹی ایم۔اے)

۴) ڈاکٹر عبدالرؤف ملک (پروفیسر عبدالرشید ایم۔ایس۔سی)

(ایڈیٹر)

(کمرے میں ڈاکٹر گوئبلز اور اس کا سکریٹری)

گوئبلز:۔ سکریٹری!

سکریٹری:۔ حضور۔

سخت حیرت کی بات ہے کہ آج تک ہندوستان میں بغاوت نہیں ہوئی۔ کانگریس خاموشی سے جیل خانے بھر رہی ہے۔ مسلم لیگ حکومت برطانیہ کی مدد کا اعلان کر چکی ہے۔ اور سر سکندر حیات خاں رنگروٹ اور پیسے سے حکومت کی مدد کر رہا ہے یہ معاملہ کیا ہے؟

سکریٹری:۔ میرا خیال ہے کہ جرمنی سے اردو پراپا گنڈا اچھی طرح نہیں ہو رہا۔"

گوئبلز:۔ تمہارا مطلب۔"

سکریٹری:۔ مطلب یہ کہ ڈاکٹر عبدالرؤف ملک عموماً سچی باتیں بتلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں سچ بولنا حماقت میں شامل ہے۔ نیز سچ کا اثر عام لوگوں پر کوئی اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے میری رائے یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر عبدالرؤف ملک کو آج ہی بلا کر خاص جرمن طرز پر پراپا گنڈہ کرنے کی ہدایت کی جائے۔

گوئبلز:۔ تو گویا یہ ڈاکٹر سچ بول کر ہمارے مقصد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اچھا اسے ابھی بلاتا ہوں۔"

گھنٹی بجا کر:۔ اردلی

(اردلی اندر آتا ہے۔ اور جھک کر سلام کرتا ہے)

گوئبلز:۔ دیکھو! ڈاکٹر عبدالرؤف ملک کو حاضر کرو۔

(اردلی جاتا ہے۔ اور عبدالرؤف ملک کو ساتھ لاتا ہے)

(ڈاکٹر عبدالرؤف ملک آ کر ہائیل ہٹلر کہہ کر سلام کرتا ہے۔)

گوئبلز:۔ ہائیل ہٹلر۔ کہو ڈاکٹر عبدالرؤف ملک! ہندوستانی پراپا گنڈہ کیسے چل رہا ہے۔"

ڈاکٹر رؤف:۔ پراپا گنڈہ تو خوب ہو رہا ہے۔ لیکن کوئی خاص اثر نہیں دکھائی دیتا۔"

گوئبلز: کیوں؟

ڈاکٹر رؤف: اس لیے کہ ہندوستانی تقدیر کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ کسی پراپیگنڈہ کی پرواہ نہیں کرتے۔

گوئبلز:۔دیکھو ہندوستانی بہت مذہبی ہوتے ہیں۔اور بات بات میں خدا کا ذکر کرتے ہیں۔سچ ہے۔جن کا کوئی فیورر نہ ہو وہ خدا کا ذکر نہ کریں تو اور کیا کریں۔ان سے کہوں کہ خدا جرمنی کے ساتھ ہے۔اور وہ انگریزوں کو شکست دے گا۔"

ڈاکٹر رؤف:۔"لیکن حضورِ والا۔ایک دن چرچل نے یہی بات کہی تھی۔کہ خدا اتحادیوں سے مل کر جرمنی کو شکست دے گا۔آپ نے اس کا یہ جواب دیا تھا۔کہ ایسی بات کہنا کفر ہے کیونکہ خدا صرف اتحادیوں ہی کا نہیں۔اگر اب ہم نے خدا کا نام لیا تو لوگ کیا کہیں گے۔"

گوئبلز:۔تم پراپا گنڈہ کا فن نہیں جانتے۔فیورر نے کہا ہے۔کہ عوام سے جو چاہو کہہ ڈالو۔ان کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔جھوٹ جس قدر بڑا ہوگا اتنا ہی مؤثر ہوگا۔ہندوستانیوں کو یقین دلاؤ۔کہ جرمنی ان کی آزادی کو کوشش کو بہت اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔"

ڈاکٹر رؤف:۔لیکن حضورِ والا فیورر نے اپنی کتاب "مین کیمف" میں لکھا ہے کہ انگریز کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق ہے۔اور وہی اس پر حکومت کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ ابھی چند دن ہوئے۔ہم نے انگریزوں کو کہا تھا کہ تم ہمارے دوست بن جاؤ۔ہم تمہاری سلطنت قائم رکھنے میں امداد کریں گے۔بھلا اب ہم ہندوستانیوں کو کس منہ سے کہہ سکتے ہیں۔کہ ہم ان کی آزادی کے حامی ہیں۔"

گوئبلز:۔"تم یہ کیا باتیں کر رہے ہو۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ "مائن کمیف" کا جو ترجمہ انگریزی میں چھپا ہے وہ غلط ہے۔"

ڈاکٹر رؤف:۔حضورِ والا کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔لیکن خیر کوئی اور ارشاد۔

ڈاکٹر گوئبلز:۔آج تمہارا دماغ صحیح نہیں۔ ہم تمہیں اس لیے اس قدر تنخواہ دے رہے ہیں۔ کہ تم پیٹ کی فکر سے آزاد ہو کر دماغ درست رکھو۔اور ہمارے حکم کی تعمیل کرو۔"

ڈاکٹر رؤف:۔لیکن حضورِ والا۔۔۔۔

گوئبلز:۔ میں لیکن ویکن نہیں سنتا۔ ہندوستانیوں کو یقین دلاؤ۔ کہ انگریز ان کے جانی دشمن ہیں یونہی کسی فرضی وائسرائے کا نام جڑ دو۔مثلاً یوں کہو۔ کہ برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم سالسبری کے لڑکے لارڈ سیل نے جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کا وائسرائے رہ چکا ہے کہا تھا کہ ہم ہندوستانیوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں گے۔"

ڈاکٹر رؤف:۔لیکن حضورِ والا یہ تو بالکل غلط ہے۔نہ سالسبری کا کوئی لڑکا لارڈ سیل تھا۔ نہ وہ کبھی ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔نہ کسی وائسرائے نے ایسی بات کہی۔اتنا سفید جھوٹ بولنا مشکل ہے۔ ہندوستانی اس جھوٹ کو سنیں گے تو کیونکر سچ مان لیں گے۔"

گوئبلز:۔"تم جانتے ہو۔کہ کس سے بات کر رہے ہو۔ میں آڈلف ہٹلر کا پروپیگنڈا منسٹر ہوں۔تمہارا یہ بیہودہ رویہ ناقابل برداشت ہے۔ میں تمہیں ایک حکم دے رہا ہوں۔اور تم اے غلام ہندوستانی! ٹائیں ٹائیں کر رہے ہو۔اسی وقت جاؤ۔اور حکم کی تعمیل شروع کر دو۔ ورنہ ایک ذلیل یہودی کی طرح تمہاری کھال کھینچ لی جائے گی۔

(کڑک کر) تمہاری کھوپری میں عقل ہے یا نہیں؟ بات کو سمجھے یا نہیں۔؟

ڈاکٹر رؤف:۔(کانپتے ہوئے) بہت اچھا حضور۔ میں جناب کے حکم کی ہمہ تن تعمیل کروں گا۔(ڈاکٹر رؤف براڈ کاسٹنگ سٹیشن پر چلا جاتا ہے)

جرمنی انونسر:۔

Tha shaghufta in the Birleen, in thekhish on zulooghoo in botu bakheem tha refaan fleeghteegha far bleekan tha inspling erkheen, P.P. Koo. Koo.Koo. P., Neekha & Zeekha meter bund Naakhishpa in Hindustani.

انگریزی انونسر:

This is Berlin calling, in far Eastern Service, operating by two transmitting station D.J.P, and D.J.R., in the 19th and 16th meter band. You are now about to hear our daily news-bulletine in Hindustani.

اب آپ برلن کی چھوٹی لہروں والے سٹیشن ڈی۔ جے۔ آر ۳۱. ۲۵ میٹر اور ڈی۔ جے۔ پی ۵۶. ۱۹ میٹر سے ہندوستانی میں خبریں سنیے۔ یہ خبریں آپ بڑے شوق سے اپنے اخباروں میں چھاپ سکتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں کو بھی سنا سکتے ہیں۔

۱) برطانیہ کے سابق وزیر اعظم سالسبری کے لڑکے لارڈ سیل نے ۱۸۵۷ء میں جبکہ وہ ہندوستان کا وائسرائے تھا یہ کہا تھا ہم ہندوستانیوں کے خون کا آخری قطرہ چوس لیں گے۔ کل دہلی کے ریڈیو سٹیشن نے بتایا۔ کہ اس سال ہندوستان میں سخت قحط پڑا ہوا ہے۔ اور ہر روز ہزاروں لاکھوں آدمی بھوکے مر رہے ہیں۔ تمام ملک میں پلیگ، ہیضہ اور چیچک پھیلی ہوئی ہے۔ بارش نام کو نہیں ہوئی۔ کنوئیں سوکھ گئے ہیں۔ اور پانی پینے کو

نہیں ملتا۔

۲) ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔ کہ کانگریس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی اور مہادیش بھگت ساورکر۔ جو ہندوسبھا کے پروہاں ہیں کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ اور سبھاش چندر بوس اس جھگڑے کو سلجھانے کے لیے جرمنی کے بڑے بڑے مدبروں کے ساتھ مشورہ کرنے کی خاطر برلن آرہے ہیں۔ سبھاش چندر بوس یہ سفر جرمنی کی سیکرٹ بس سروس میں کریں گے۔

۳) جرمنی کا اخبار (CONSTIPATOIN) لکھتا ہے کہ جاپان نے نہر پانامہ پر حملہ کرتے ہوئے یونان کی راجدھانی (ATHENS) کو فتح کرلیا ہے۔

۴) سویڈن کی راجدہانی سے خبر آئی ہے۔ کہ ایران کی فوجیں فرانس کو روندتے ہوئے ناروک میں داخل ہوگئی ہیں۔ انھوں نے خلیج مرتبان کو بھی فتح کرلیا ہے۔

(ہم برلن سے بول رہے ہیں اور آپ کو ہندوستانی میں خبریں سنا رہے ہیں)

۵) ہم جرمن ہائی کمانڈ کے کل والے بیان میں بتا چکے ہیں کہ جرمن ہتھیار بند ہوائی جہازوں نے جو لنڈن پر حملہ کیا تھا۔ اس میں (SOUTHAMPTION) کے فوجی اڈوں، ہوائی بندرگاہوں، تیل کے نلوں، ہوائی جہاز بنانے والے کارخانوں، مال کے گوداموں، مکانوں، دکانوں، گرجوں، بازاروں، گلی کوچوں، سپاہیوں کے جمگھٹوں، راکھ کے ڈھیروں، ریل کی پٹڑیوں، ریل کے جنکشنوں، چوہوں معاف کیجئے گا چوراہوں کو بموں کا نشانہ بنایا گیا۔ بڑی تعداد میں دھماکے سے پھٹنے والے اور گن بم پھینکے گئے۔ تمام شہر میں آگ پھیل گئی۔ اس کی روشنی ۹۰ ہزار فٹ کی بلندی سے بہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ لنڈن کی حفاظتی توپوں نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن

جرمنی کے بہادر ہوائی جہاز ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے کام کو چوبیس گھنٹے تک جاری رکھ سکے۔

۶) سپین کا اخبار (BRONCITUS ISNOMINATIEN) DO, POPOLO LA DE VELATA کے لنڈن والے نامہ نگار نے لنڈن کی بم باری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حملہ پہلے حملوں سے کہیں زیادہ زور دار تھا۔ اس حملہ میں جو نقصان ہوا ہے۔ اس کا حساب لگانے کے لیے ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔

(ہم برلن سے بول رہے ہیں اور آپ کو ہندوستانی میں خبریں سنا رہے ہیں)

۷) جرمنی کی ایک ڈبکنی کشتی بنام (D Y S E U T R Y) کے کمانڈر مارشل (CHOBRA) نے اپنے سفر سے واپس ہوتے ہوئے ایک بیان دیا ہے جس میں بتایا کہ ہماری کشتی نے برطانیہ کے بیس لاکھ چھٹانک وزن کے ہتھیار بند تجارتی جہاز بحر اوقیانوس کے مہاساگر میں ڈبو دیے ہیں۔ اس کشتی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ رود بار انگلستان میں غوطہ لگا کر بکنگھم پیلس کے تیرنے والے تالاب میں جانکلی۔ اس پر شاہی محل کے پہرہ داروں نے گولیاں چلانے کی کوشش کی تو وہاں سے اڑ کر برلن میں آپہنچی۔ مارشل کالراکو ان کی خدمات کے صلہ میں یورپ کے فیور ہٹلر نے لوہے کا چمچہ عطا کیا ہے۔

۸) نیویارک کے اخبار "TUFAN COOKING EXPRESS" کے نامہ نگار مقیم شہر خموشاں نے اطلاع دی ہے کہ (ICELAND) کی فوجوں نے آج دو پہر کے بعد روٹی کھا کر آسٹریلیا پر دھاوا بول دیا۔ اور آسٹریلیا کا صدر عصمت

انونو بھاگ کر تبروک میں پناہ گزیں ہوا ہے۔

(ہم برلن سے بول رہے ہیں)

اب ہم آپ کی خدمت میں جرمن ہائی کمانڈ کے تازہ بیان کو پیش کرتے ہیں۔

باوجود موسم خراب ہونے کے ہمارے ہتھیار بند ہوائی جہاز آسمانی بلاؤں کی طرح پرے باندھ کر انگلستان کے وسطی، شمالی اور جنوبی اور مشرقی علاقوں میں جادھمکے۔اور دل کھول کر بھاری قسم کے دھماکے سے پھٹنے والے، چیخنے والے اور اگن بم ہر جگہ برسائے۔سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں میں ۹۳۵ کارخانوں کو آگ لگادی گئی۔ ۴۵۷ مکھیاں، ۶۲۰ شیر، ۱۶۸۰ الومڑ، ۳۰۲ گیدڑ جان سے مارے گئے۔اور بہت سے زخمی بھی ہوئے۔زخمیوں کو کینیڈا کے ہسپتالوں میں ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہنچادیا گیا۔

۹) بحیرہ روم میں مالٹا کی بندرگاہ "MADULA OBONGATA PONS VEROLIE" پر سخت بم باری کر کے ۴۸۵ مربع میل زمین کو سمندر کی تہ میں پہنچادیا گیا۔ہم اس ڈوبی ہوئی زمین کو رسّوں سے کھینچ کر سسلی کی مشہور بندرگاہ (SHOE TOE) میں لے آئے ہیں۔اب اس پر(FIELD MASHAL GOEING) بھینسے چرایا کریں گے۔

۱۰) آج برطانیہ کے بڑے جنگی جہاز "ARC ROYAL" کو گیارہویں دفعہ جھیل دولتانہ میں ڈبودیا گیا ہے اس پر حاجی لق لق، مولوی گوڈے گوڈے اور پیر بغلول سوار تھے۔اس جہاز کی کمان سند باد جہازی کے ہاتھ میں تھی۔

ابھی ابھی ہمارے پاس ایک خبر آئی ہے۔اسکو بھی سن لیجئے۔آل انڈیا کانگرس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی اور راشٹر پتی مولانا آزاد ابو الکلام (ADULT

(HITLER) سے ملاقات کرنے کیلیے تشریف لا رہے ہیں۔ برلن کے سرکاری حلقوں میں بکری کا چارہ مہیا کرنے کے سلسلہ میں سخت پریشانی کا سامنا ہو رہا تھا۔اس لیے مہاتما جی نے اپنی بکری بحیرہ قلزم میں ڈبو دی ہے۔

آپ یہ جھوٹی یعنی سچی خبریں برلن سے سن رہے تھے۔کل ہم پھر رات کے آٹھ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔اور آپ کو گول مول خبریں سنائیں گے۔

آداب عرض۔

[مطبوعہ مشعل مجلہ گورنمنٹ کالج اٹک (جنگ نمبر)؛ بابت: مارچ ۱۹۴۱ء]

☆☆☆

ہٹلر کی حکومت کا ایک خونین ورق

برلن ریڈیو سٹیشن سے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ آج سے چالیس سال پہلے انگریزوں نے افریقہ میں حبشیوں پر جنگ بوہرا کے سلسلے میں بہت مظالم توڑے تھے۔ اور کہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کا نامۂ اعمال ازبس سیاہ ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کی اپنی تاریخ حکومت کا یک ''روشن'' ورق یہاں درج کریں۔

جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ تو جماعتِ مخالف کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا۔ چنانچہ ہزار ہا جرمنوں کو گرفتار کر کے کیمپوں میں پھینک دیا گیا۔ ان کیمپوں کا یہ حال تھا۔ کہ ۶۶ گز لمبے اور ۲۶ گز چوڑے کیمپوں میں اڑھائی اڑھائی ہزار آدمی بھر دیے جاتے تھے یہ قیدی سولہ گھنٹے روزانہ کام کرتے تھے۔ ان کا کام بڑے بڑے وزنی پتھروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانا۔ اور بھارے چھکڑے کھینچنا ہوتا تھا۔ انھیں سخت گرمیوں میں بھی کام کے اوقات میں پانی پینے کی اجازت نہ تھی۔ معمولی معمولی جرائم پر پچیس پچیس دُرّوں کی سزا دی جاتی تھی۔ اور اگر کوئی قیدی مار پیٹ کے دوران میں رو دیتا۔ یا شور مچاتا تو اس کی سزا پینتیس سے ساٹھ دُرّوں تک کر دی جاتی تھی۔ انھیں خوراک بہت کم دی جاتی تھی۔ یہودی قیدیوں کو الٹا لٹکا کر پیٹا جاتا تھا۔ اور انھیں اس وقت تک آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ جب تک وہ جرمنی سے چلے جانے کا عہد نہ کر چکتے۔ ان کیمپوں کے افسر عموماً یہودیوں کو کہا کرتے تھے۔

بندوق کی ایک گولی کی قیمت تقریباً آٹھ آنے ہے۔ اور ایک یہودی اس قابل نہیں کہ اس پر آٹھ آنے کی گولی ضائع کی جائے۔''

ان کیمپوں کے ارد گرد لوہے کے تار تھے۔ جن میں ایک ہزار وولٹ کی بجلی بھری ہوئی تھی اگر کوئی یہودی قیدی بیمار پڑ جاتا۔ تو اس کا کام دگنا کر دیا جاتا۔ جرمن افسر کہا کرتے تھے:

''یہودی یا تو کام کرے اور یا موت کی آغوش میں آرام کرے ہم اسے رخصت دینے کے لیے تیار نہیں۔''

بعض قیدیوں کو الٹا اور بعض دیگر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں بارہ بارہ گھنٹے درختوں سے لٹکا دیتے تھے۔ بعض کے کان۔ ناک اور ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں۔ بعض قیدیوں کی خوراک میں شیشہ پیس کر ملا دیا جاتا تھا۔ ایک پادری کو۔ جس پر باغی ہونے کا شبہ تھا۔ جرمن بلیک گارڈ نے مکان کی چھٹی منزل سے سڑک پھینک دیا تھا۔ ایک جرمن افسر نے یہودی قیدیوں کو ایک دن کہا۔

''ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں گے کہ تم اس سلوک کو بھول جاؤ گے جو فرعون نے مصر میں تمہارے آباؤ اجداد سے کیا تھا۔''

بید لگانے والے اچھل کر پوری طاقت سے بید مارتے تھے۔

جب ۱۱۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو ہرفان راتھ ایک یہودی نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو آسٹریا میں جرمنوں نے یہودیوں کی دکانوں، گھروں اور کارخانوں کو آگ لگا دی سڑکوں پر ہر طرف یہودیوں ہی کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ پولیس یہودیوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیتی تھی۔ اور انھیں۔ جھک کر ماتھے سے زمین کو چھونے کا حکم دیتی تھی اگر کسی کا ماتھا زمین تک نہیں پہنچتا تھا۔ تو اس کی گردن پر لاتوں، گھونسوں اور ڈنڈوں کی بارش برسائی جاتی تھی۔

ہر ہٹلر کا نادر شاہی حکم: ۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء کو ہرفان راتھ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے ہر ہٹلر

نے مندرجہ ذیل حکم جاری کیا۔ حکومتِ جرمنی میں رہنے والے یہودیوں (اُن کی تعداد دس لاکھ تھی) کو حکم دیا جاتا ہے:

(الف) کہ وہ آئندہ کوئی ہتھیار اپنے پاس نہ رکھیں۔ چاقو تک رکھنے کی ممانعت ہے

(ب) کہ یہودی ڈاکٹروں اور وکیلوں کو پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں۔

(ج) کہ ہر یہودی پر خواہ وہ بچہ ہو یا جوان ہو۔ مرد ہو یا عورت۔ مفلس ہو یا تونگر ۱۳۶ پونڈ جرمانہ کیا جاتا ہے اور اس جرمانے کو وصول کرنے کے لیے ہر یہودی کی جائداد کو ضبط کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

(د) بینکوں میں یہودیوں کا تمام پیسہ بحق سرکار ضبط کیا جاتا ہے۔

(ہ) یہودیوں کے تمام اخبار، سینما، تھیٹر اور کلب سلطنتِ جرمنی میں بند کیے جاتے ہیں۔

(و) تمام یہودی مدارس بند کیے جاتے ہیں۔ نیز حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی یہودی بچہ کسی سکول میں داخل نہ کیا جائے۔

(ز) کوئی یہودی کسی سینما۔ کلب۔ سکول۔ تماشے یا جلسے میں شام نہیں ہوسکتا۔

(ح) جن یہودیوں کو قید کیا جائے۔ وہ جیل میں اپنا خرچ خود برداشت کریں۔ اگر کوئی یہودی مفلس ہو۔ تو اس کا خرچ مالدار یہودی ادا کرے۔

ہٹلر کے اس حکم کے بعد یہودی سلطنت جرمنی سے باہر چلے گئے۔ مندرجہ بالا حکم کے رو سے یہودیوں پر تیرہ کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ یا 2,17,60,00,000 روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا۔ یہ رقم حکومت ہند کی سالانہ آمدنی سے بقدر اسّی کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔

کانگرس اور برطانیہ:

کانگرس نے بارہا سول نافرمانی کی۔ ولائتی سامان کا بائیکاٹ کیا سکولوں اور کالجوں کو

برباد کر کے نئے نیشنل مدارس جاری کیے سات صوبوں کی آئینی حکومتوں کو معطل کر کے رکھ دیا۔ اور اب جبکہ جنگ جاری ہے۔ مہاتما جی نے پھر سول نافرمانی شروع کر رکھی ہے۔ انگریز کا حوصلہ دیکھئے کہ وہ اس مشکل اور نازک وقت میں بھی انسانوں کا سا برتاؤ کر رہا ہے۔ سیاسی قیدیوں کو اے کلاس میں رکھا جاتا ہے۔ ان پر نہ تو دُرّے برسائے جاتے ہیں۔ اور نہ انھیں الٹا لٹکایا جاتا ہے۔ داروہا سے ہر روز مختلف صوبوں کی طرف نافرمانی کرنے کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ انگریز کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ حکام کی ذمہ داریوں کو بڑھانے بلکہ الجھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ لیکن انگریز کا حوصلہ دیکھئے کہ وہ سب کچھ نہایت اطمینان سے دیکھ رہا ہے۔ اور برداشت کر رہا ہے اگر یہاں انگریز کی جگہ حضور ہر ہٹلر صاحب فرمانروا ہوتے تو جانتے ہو کیا ہوتا؟ وہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یعنی ہر روز سینکڑوں پولیٹیکل ورکرز چمگادڑوں کی طرح الٹے لٹکتے دکھائی دیتے ہزاروں کی پیٹھ سے کھال ادھڑ جاتی ہر شہر پر کروڑ کروڑ روپیہ جرمانہ ہوتا۔ جائدادیں ضبط کی جاتیں۔ سیاسی قیدیوں سے بڑے بڑے وزنی پتھر اٹھوائے جاتے۔ انھیں سخت پیاس میں پانی پینے کی اجازت نہ ہوتی۔ اور کھانا بہت کم دیا جاتا۔ انصاف سے کہو۔ کہ اگر ہندوستان کے آرام طلب۔ سست اور کاہل لوگوں سے چندروز ہی یہ سلوک ہوتا۔ تو پھر وہ آزادی کا نام بھی لیتے؟

یہ میں مانتا ہوں کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ لیکن جب تک ہندوستان میں موجودہ تنگ نظری باقی ہے۔ ہم خدا کے فضل سے غلام ہی رہیں گے اور میرا خیال یہ ہے۔ کہ اگر غلام ہی رہنا ہے تو انگریز سے بہتر آقا اس وقت کہیں اور موجود نہیں۔

☆☆☆

برطانیہ جرمنی اور اٹلی کی بحری طاقت

اور جنگ میں ابتک نقصانات

آغازِ جنگ میں مذکورہ الصدر طاقتوں کے پاس جہازات کی تعداد یہ تھی۔

	جہازوں کی قسمیں	برطانیہ	جرمنی	اٹلی
ا۔	تجارتی جہاز	8977	2459	1227
۲۔	جنگی جہاز (چھوٹے بڑے)	1237	جرمنی اور اٹلی ہر دو کے ملاکر	658
۳۔	ڈبکنی کشتیاں	105	-"-	193
۴۔	تجارتی جہازوں کا وزن	21,00,1925	44,82,662	34,24,804

یہ جنگ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس جنگ میں شہروں پر بمباری کے علاوہ سمندروں میں تجارتی و دیگر جہازات کو دھڑ ادھڑ ڈبویا گیا۔ سمندروں میں اب تک کس قدر جہازات ڈبوئے گئے۔ کسی کو صحیح علم نہیں۔ جرمنی کی خبریں عموماً غلط ہوتی ہے۔ اور برطانیہ بعض مصلحتوں کی بنا پر صحیح اعداد و شمار شائع نہیں کرتا۔ تاہم جو کچھ ہمیں اب تک معلوم ہو سکا ہے وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۰ء کو سر والٹر (جو محکمۂ حفاظت برطانیہ کے ایک افسر ہیں) نے کہا کہ اب تک ہمارے چالیس لاکھ ٹن، جہاز غرق ہو چکے ہیں۔

سر آرتھ سالٹر نائب وزیر بحر نے ۲۸ جنوری ۱۹۴۱ء کو فرمایا۔ کہ ہمارا جہازی نقصان نوے ہزار ٹن فی ہفتہ کے حساب سے ہو رہا ہے (یہ ہر دو خبریں برلن نے سنائی

تھیں) ۷۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو بی بی سی سے بتلایا گیا۔ کہ برطانیہ کا ہفتہ وار نقصان اوسطاً ستر ہزار ٹن ہے۔

جنگ کو شروع ہوئے اٹھہتر ہفتے ہو چکے ہیں۔ اگر برطانیہ کا جہازی نقصان ستر ہزار ٹن فی ہفتہ تسلیم کیا جائے، تو مجموعہ 54,60,000 ٹن بنتا ہے۔

برلن ریڈیو کا اندازہ:

۲۴۔ جون ۱۹۴۰ء کو برلن ریڈیو نے بتلایا تھا، کہ برطانیہ کے اس وقت تک ستر لاکھ ٹن کے جہازات ڈوب چکے تھے۔ جن میں تین لاکھ ٹن جنگی جہاز شامل نہیں تھے۔ اس کے بعد تین جنوری ۱۹۴۱ء کو کہا کہ ۲۵۔ جون ۱۹۴۰ء سے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۴۰ء تک برطانیہ کے دو لاکھ ٹن کے جنگی جہاز اور ۱۴۱ لاکھ ٹن تجارتی جہاز ڈوب چکے ہیں۔ جن میں ناروے کے غرق شدہ پچاسی جہاز شامل نہیں۔ یکم جنوری ۱۹۴۱ء سے اب تک 137013 ٹن کے جہازات کے غرق ہونے کا برلن سے اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے تمام غرق شدہ تجارتی جہازوں کا وزن 2475013 ٹن اور جنگی جہازوں کا پانچ لاکھ ٹن بنتا ہے۔

بحیرۂ روم اور بحر اوقیانوس پر برطانیہ کی قاہرانہ حکومت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ برلن سفید جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر برطانیہ کی بحری طاقت اس قدر کمزور ہو چکی ہوتی۔ تو ہٹلر مدت سے جزیرۂ برطانیہ پر حملہ کر چکا ہوتا۔ شمالی افریقہ میں بجائے فتح کے برطانیہ کو شکستیں ہو رہی ہوتیں۔ اور اٹلی کی فوجیں مشرقی افریقہ میں سویز کے راستہ سے دھڑا دھڑ جا رہی ہوتیں۔ مسولینی اور ہٹلر کی بے بسی صاف صاف بتلا رہی

ہے۔ کہ برطانیہ بدستور سمندروں کی ملکہ ہے۔

ہٹلر کی بے بسی:

ہٹلر نے باشندگانِ جزیرۂ برطانیہ کو بدحواس بنانے کے لیے ان پر بے پناہ حملے کیے۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۴۰ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء تک جزیرۂ برطانیہ پر دو ہزار حملے ہوئے۔ جن میں چار کروڑ تیس لاکھ سیر دھماکے سے پھٹنے والے بم اور سولا لاکھ سیر آگ کے بم برسائے گئے۔ ۲۷ شہروں کو جن میں نور پول، ساؤتھمپٹن، لنڈن، کینٹر بری اور برمنگھم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہت سخت نقصان پہنچایا۔ لیکن شیر برطانیہ کی نہ تو ہمت ٹوٹی۔ اور نہ حواس میں کوئی فرق آیا۔ چند روز ہوئے۔ بی بی سی نے بتلایا کہ آغازِ جنگ سے اب تک جرمنی کے 5585 طیارے تباہ کیے جا چکے ہیں۔ صرف جنوری میں جرمنی کے علاقہ پر پانچ لاکھ سیر کے بم برسائے گئے۔ نیز جرمنی کے 270 شہروں پر سترہ سو حملے ہو چکے ہیں۔ برطانیہ کے یہ حملے روز بروز شدید سے شدید تر ہو رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جب ہٹلر صلح کی درخواست دے کر اپنے آپ کو برطانیہ کے رحم و کرم پر ڈال دے گا۔

[مطبوعہ: مجلّہ مشعل، گورنمنٹ کالج، اٹک (جنگ نمبر) بابت: ۱۹۴۱ء]

☆☆☆

پیامِ آزادی...... "پولینڈ"

اٹھارہویں صدی کے اواخر تک پولینڈ ایک باقاعدہ سلطنت تھی۔ جس میں پولینڈ کے علاوہ لتھونیا، سفید روس، شمالی ڈینسٹر اور ڈینپر بھی شامل تھے۔ اس کے بعد اس سلطنت کی حدود بدلتی رہیں۔ اور معائدہ ورسائی کے مطابق اس ملک کی نئی حدود قائم کی گئیں۔

باشندگان پولینڈ کہاں سے آئے۔ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کب سلطنت قائم کی۔ اور اس سلطنت کی حدود کیا تھیں۔ یہ وہ سوال ہیں۔ جن کے جواب تاریخ میں موجود نہیں۔ کیف کے ایک پادری نسٹر (جس کی وفات ۱۱۱۵ء میں ہوئی تھی) کی تحریروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پولش پہلے دریائے ڈینیوپ کے کنارے وحشیانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کا مذہب بت پرستی اور مظاہرہ پرستی تھا۔ وہاں سے یہ لوگ رومن حکمرانوں کی سخت گیری کی وجہ سے بھاگ کر پولینڈ میں آ گئے۔ پہلے کچھ مدّت تک جنگلوں میں گھسے رہے۔ اس کے بعد جب کسی قدر متمدن ہو گئے۔ اور ان میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ تو ۹۶۲ء میں پرنس ریموٹ نے موریوین امپائر کے ایک صوبے پر قبضہ جما لیا۔ اور اس طرح پولش سلطنت کی داغ بیل پڑ گئی۔ چونکہ یہ لوگ مشرکانہ عادات کے لوگ تھے۔ اور ان کے ہمسائے یعنی جرمن عیسائی تھے۔ اس لیے ان کی آپس میں بنتی نہ تھی۔ آئے دن کے جھمیلوں سے تنگ آ کر شاہِ پولینڈ نے عیسائیت قبول کر لی۔ اور یہ قدم غالباً ۹۷۰ء میں اٹھایا گیا تھا۔

۱۷۰۰ء میں جرمنی کے حکمراں فریڈرک ولیم اور شاہِ روس نے سویڈن کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ جو بیس سال تک جاری رہی۔ اس میں پولینڈ بھی کود پڑا۔ روس اور جرمنی نے چال یہ چلی کہ میدانِ جنگ میں تو پولینڈ کے سپاہی کٹوائے۔ راشن اور دیگر سامانِ جنگ بھی پولینڈ ہی سے لیا، لیکن خاتمہ جنگ کے بعد تباہ شدہ پولینڈ سے اس کی حفاظت کی بھی قیمت مانگنی شروع کر دی۔ آگسٹس فرمانروائے پولینڈ نے فریڈرک کو یہاں تک کہا۔ کہ پرشیا کورلینڈ اور پولینڈ کے چند دیگر اضلاع لے لو۔ اور میری جان چھوڑو۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ اسی دوران میں آگسٹس مر گیا۔ اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ نئے بادشاہ کے انتخاب پر بھی رشوتوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک طرف روس اور دوسری طرف جرمنی کی چھیڑ چھاڑ سے حکومت پولینڈ کو دم بھر بھی چین میسر نہ ہوا۔ بیرونی چھیڑ چھاڑ الگ اور امراء و وزرا کی بد عہدیاں جُدا۔ حکومت کی اس بدنظمی، امرا کی اس بدعہدی اور غدّاری کا خمیازہ آخر پولینڈ کو بھگتنا ہی پڑا۔ ۱۷۹۰ء میں جرمنی، روس اور آسٹریا نے مشورہ کر کے پولینڈ کے بعض علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ روس نے ۱۵۸۶ مربع میل علاقہ جس کی آبادی ساڑھے پانچ لاکھ تھی، ہتھیا لیا۔ آسٹریا نے ۱۷۱۰ مربع میل علاقہ (جس کی آبادی آٹھ لاکھ سولہ ہزار تھی) ہڑپ کر لیا۔ اور جرمنی کے حصے میں ۶۲۹ مربع میل زمین آئی۔ جس کی آبادی تین لاکھ اٹھتر ہزار تھی۔ دوسرے لفظوں میں پولینڈ کو ایک چوتھائی زمین اور تقریباً بیس فیصدی آبادی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک طرف سویڈن نے اور دوسری طرف ترکوں نے روس پر حملہ کر دیا۔ پولینڈ کے بعض اہلِ نظر نے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھا کر جرمنی سے یارانہ گانٹھ لیا۔ اور روس کو آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔

جرمنی نے اس دوستی کی قیمت میں ڈینزگ کی بندرگاہ طلب کی۔ پولینڈ راضی نہ ہوا۔ اور ۱۷۹۱ء میں جرمنی سے کٹ کر روس سے جاملا۔ پولینڈ کی اس بری حالت سے متاثر ہوکر بعض محبانِ وطن انقلاب کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ چنانچہ ۳ مئی ۱۷۹۱ء کو پولینڈ میں انقلاب رونما ہوا۔ انقلابیوں نے تمام بری رسوم اور برے قوانین کی تنسیخ کردی۔ عدالتوں اور دفتروں کو صحیح اخلاقی معیار پر قائم کیا۔ رشوت بند کردی۔ قانون کی نگاہ میں چھوٹا بڑا برابر کردیا۔ اور دولت کی تقسیم منصفانہ کردی۔ اس پر روس بھڑک اٹھا اور اس آئین کو بدعت قرار دے کر پولینڈ پر حملہ کردیا۔ تین ماہ کی جنگ کے بعد پولینڈ کو شکست ہوئی۔ روس نے پولینڈ کے تمام مشرقی اضلاع پر جن کا رقبہ اڑھائی لاکھ مربع میل تھا، قبضہ کرلیا۔ اور مغرب میں جرمنی نے ایک بہت بڑا علاقہ جس میں ڈینزگ بھی شامل تھا، ہتھیالیا۔ بیس سال پہلے پولینڈ کی آبادی ایک کروڑ پندرہ لاکھ تھی اور اب صرف ۳۵ لاکھ باقی رہ گئی تھی۔ باقی آبادی پر روس، جرمنی اور آسٹریا قابض ہو چکے تھے۔ ان طاقتوں نے پولینڈ میں نئے آئین کی جگہ وہی پرانا دقیانوسی نظام نافذ کردیا تھا۔ جس میں بیرونی طاقتوں کا بھلا تھا۔ ۱۷۹۴ء میں روس نے پولینڈ پر پھر حملہ کردیا۔ سخت لڑائی کے بعد پولینڈ کو شکست ہوئی۔ جرمنی آسٹریا اور روس نے پولینڈ کے کچھ اور علاقے ہتھیا لیے۔ ۱۸۱۳ء میں روس نے وارسا فتح کرلیا۔ ۱۸۱۵ء میں جرمنی آسٹریا اور روس نے ایک چھوٹے سے علاقے کریکو کو چھوڑ کر جس کی کل آبادی ۲۱۰۰۰ تھی باقی تمام پولینڈ بانٹ لیا۔ ۱۸۱۵ء میں زارِ روس کو پولینڈ پر رحم، اور کچھ علاقہ واپس دے کر اپنی نگرانی میں ایک جمہوریت بنا ڈالی۔ جس کا صدر زارِ روس کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں چند وطن پرستوں نے روس کے خلاف بغاوت کردی اس پر روس نے کر

یکو کے علاوہ باقی سارے ملک پر قبضہ جمالیا۔ ۱۸۴۸ء میں جرمنی نے کریکو پر قبضہ کر لیا۔ اور آزاد پولینڈ ایک دفعہ پھر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا! روس نے پولینڈ کی یونیورسٹیاں بند کر دیں۔ ان کی زبان مٹانے پر بھی کمر باندھ لی۔ دفتروں اور سکولوں میں روسی زبان لازمی قرار دے دی۔ اس پر حب وطن کی آگ پھر سلگنے لگی۔ اور پندرہ برس بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں انقلاب بن کر بھڑک اٹھی۔ اس انقلاب کو روس نے آہنی پنجے سے کچل دیا۔ اور پولینڈ پورے پچاس سال کے لیے غلام بن کر رہ گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حب الوطنی کے جذبات بہت بڑھ گئے۔ اور خدا نے اس قوم کو ایک لیڈر بھی دے دیا۔ یعنی جوزف پلسڈسکی۔ جس نے ۶ اگست ۱۹۱۴ء کو صرت تین سو محبان وطن کے ہمراہ روس پر حملہ کر دیا۔ یہ تین سو بڑھتے بڑھتے بارہ ہزار بن گئے۔ یہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ روس ایک طرف جرمنوں اور ترکوں سے الجھا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف پولینڈ سے۔ جب ۱۹۱۶ء میں جرمنی کی افواج وارسا میں داخل ہوئیں۔ تو جرمنوں نے پولینڈ کو اختیار دے دیا۔ کہ اگر وہ چاہے تو جرمنی کی قیادت میں روس کے خلاف لڑائی جاری رکھ سکتا ہے۔ لیکن جوزف نے کہا کہ میں ملک کی آزادی کے لیے جنگ کر رہا ہوں۔ اس لیے پہلے تمہیں باہر نکالوں گا۔ اور پھر روس سے نبٹوں گا۔ جرمنوں نے جوزف کر پکڑ کر جیل میں پھینک دیا۔ جہاں سے وہ جنگِ عظیم کے بعد نکلا۔ اور پولینڈ میں پہنچ کر عنانِ حکومت سنبھال لی۔ معاہدۂ ورسائی میں پولینڈ کی حدود متعین کر دی گئیں۔ اور پولینڈ دوبارہ ایک آزاد ملک بن گیا۔ جرمنی کو جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں سے یہ شکایت تھی۔ کہ اسے سمندر تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے جرمنی کی آنکھ ڈینزگ پر لگی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اس نے اس تکلیف کا

اظہار ذرا کرخت لہجے سے شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی پولینڈ کو کچلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں جرمنی اور روس نے ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے آدھا پولینڈ روس اور آدھا جرمنی کے حصے میں آیا۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے پولینڈ پر دھاوا بول دیا۔ اور دو چار دن کے بعد روس کی فوجیں بھی پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ ۳۔ ستمبر کو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ۱۸۔ ستمبر کو پولینڈ کی مزاحمت ٹوٹ گئی۔ اور یہ بدقسمت ملک ایک دفعہ پھر غلام بن کر رہ گیا۔ گذشتہ دس سو سالہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ پولینڈ ہمیشہ روس اور جرمنی کے جولانگاہ بنا رہا۔ اور اس چھوٹے سے بدقسمت ملک کو کبھی بھی چین نصیب نہ ہوا۔ معاہدہ ورسائی نے اس ملک کو ایک شاندار ملک بنا دیا تھا۔ اس کی آبادی چند لاکھ سے بڑھ کر تین کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ خوش حالی اور فارغ البالی کے تمام وسائل موجود تھے۔ لیکن روسی اور جرمنی عقابوں کی نگاہ مدت سے اس کبوتر پر لگی ہوئی تھی۔ جرمنی کو یہ بھی رنج تھا کہ ڈینزگ تک پہنچنے کے لیے اتحادیوں نے پولینڈ کو ایک ایسا راستہ دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے جرمنی کا ایک صوبہ پرشیا جرمنی سے کٹ کر مشرق کی طرف رہ گیا تھا۔ یہی وہ تکالیف تھیں اور کچھ ہوس ملک گیری بھی تھی۔ جس نے جرمنی کو پولینڈ پر ہلہ بولنے کے لیے ابھارا۔ اور اسی دیوانگی کے نتائج آج تمام عالم بھگت رہا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مشرق کی طرف سے روسی افواج پولینڈ میں داخل ہو چکی ہیں۔ جنوب کی طرف سے جنرل الیگزنڈر، روما سے سوا سَو میل آگے نکل گیا ہے۔ اور مغرب میں امریکی اور برطانوی عساکر فرانس پر اتر چکے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جرمنی جان توڑ کر مقابلہ کرے گا۔ اور اتحادیوں کو اپنی فتح کے لیے ابھی جان اور مال کی بہت بڑی

قربانی دینی پڑے گی۔لیکن اس حقیقت میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں۔کہ فتح کی منزل قریب آگئی ہے۔اور ہمیں یقین ہے کہ اطلانطک چارٹر کے مطابق پولینڈ پھر ایک آزاد ملک بن کر رہے گا۔

[اولاً پشاور ریڈیو سے نشر ہوا بعدازاں آل انڈیا ریڈیو کے ترجمان رسالے پندرہ روزہ ''آواز'' بابت: جلد نمبر ۹، شمارہ ۱۶ میں شائع ہوا۔]

☆☆☆
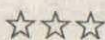
مضامین برق ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں علمی اور ادبی موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں اور سیاسی وسماجی بھی ـــــ بعض مضامین اپنے عصری منظرنامے میں تو یقیناً اہمیت اور افادیت کے حامل ہوں گے، لیکن آج شاید ان کی معنویت سوالیہ ہو۔ ایسے مضامین کی شمولیت محض اس قدر ہے کہ یہ برق صاحب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں اور بس!

برق صاحب کے فکری منہاج اور تحقیقی مباحث سے تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کا انداز نگارش اپنے اندر حسن اور رعنائی کے جو روپ رکھتا ہے، ان کی بدولت یہ تحریریں قارئین کو اپنے حصار میں رکھنے کی پوری صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔

برق صاحب مرحوم اپنے عہد کے نامور اہلِ قلم تھے۔ انھوں نے دینیات، اقبالیات، ادبیات اور سیاست وثقافت کے متنوع موضوعات پر سیکڑوں کالم اور مضامین لکھے۔ یہ مضامین رسائل میں بھی چھپتے رہے اور اخبارات میں بھی ـــــ ہنوز ان کی بیش تر تحریریں کتابی صورت میں جلوہ گری کو ترستی ہیں۔

کیپٹن عبداللہ خان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے علمی وادبی آثار مرتب کر رہے ہیں، ان کا یہ رویہ یقیناً قابلِ تحسین اور لائقِ تقلید ہے۔ وہ اگر اس سلسلے کو جاری رکھیں اور برق صاحب کے تمام غیر مدون علمی وادبی آثار کتابی صورت میں مرتب کردیں، تو ایک طرف یہ آیندہ برق صاحب پر کام کرنے والوں کو آسانی فراہم کریں گے، تو دوسری طرف خود مرتب کی نیک نامی کا باعث ہوں گے، کیوں کہ زندگی میں بڑوں کی بڑائی اور ان کے کمالات کا اعتراف تو ہر کوئی کرتا ہے، لیکن بعدِ مرگ انھیں ماننا اور ان کی یاد کو تازہ رکھنا ہر ایک کا مقسوم نہیں ہوتا ـــــ ہوسکتا بھی نہیں، کیوں کہ یہ اعتراف بڑے حوصلے، ہمت اور ظرف کا تقاضا کرتا ہے۔ مسرت کی بات یہ کہ کپتان صاحب میں یہ خوبیاں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر